حدیث کے سب سے بڑے مجموعے

مُسنَدِ اَحمَد کی حقیقت

از

جامع العلوم، محدث العصر علامہ تمنّا عمادی پھلواروی

شائع کردہ

الرحمن پبلشنگ ٹرسٹ (رجسٹرڈ)

مکان نمبر ۳ ۔ ۷ ۔ اے بلاک ۱ ناظم آباد

نزد مسجد قدوسیہ ۔ کراچی ۷۴۶۰۰

فون : ۶۲۱۴۴۹

قیمت : ------------- ۱۲/ روپے

حدیث کے سب سے بڑے مجموعے

مُسْنَدِ اَحْمَدْ کی حقیقت

از

جامع العلوم، محدث العصر علامہ تمنّا عمادی پھلواروی

ثانی [illegible]

الرحمن پبلشنگ ٹرسٹ (رجسٹرڈ)

مکان نمبر ۳ - ۷ - اے بلاک ۱ ناظم آباد

نزد مسجد قدوسیہ - کراچی ۷۴۶۰۰

فون ۶۶۱۳۳۴

قیمت : ---------- ۱۲/ روپے

تاثرات بروفات

علامہ تمنا عمادی مجیبی

مولانا ڈاکٹر عبداللہ عباس ندوی، ایم، اے، پی، ایچ، ڈی استاد فلسفۂ لسانیات، ملک عبدالعزیز یونیورسٹی جدہ مشیر امور اقلیات، رابطہ عالم اسلامی مکہ مکرمہ۔ حال ناظم تعلیمات ندوۃ العلماء لکھنؤ۔

برصغیر ہند و پاک کے ایک مقتدر عالم دین، وسیع النظر محقق اور اردو فارسی کے بلند پایہ ادیب و شاعر مولانا محی الدین تمنا[1]، ۷۰ سال کی عمر میں گزشتہ ماہ وفات پائی۔

وہ صوبہ بہار کے ایک مردم خیز قصبہ پھلواری کے رہنے والے تھے، اور ایک ایسے علمی و دینی خاندان کے رکن تھے۔ جہاں کچھ اوپر دو سو سال سے علم و مشیخت کا سلسلہ قائم ہے، ان کو فارسی اور فن عروض میں ماہرانہ دستگاہ حاصل تھی۔ مولانا سید سلیمان ندوی رحمہ اللہ نے اپنے ایک مقالہ میں بہار کی باکمال شخصیتوں کا تعارف کرایا ہے، اس میں مولانا عمادی مجیبی کا تذکرہ اسی حیثیت سے کیا ہے، یہ مقالہ سید صاحب کے مجموعۂ مقالات نقوش سلیمانی میں موجود ہے۔ مولانا عمادی مجیبی بہت ہی ذہین، اعلیٰ درجہ کے طباع اور نکتہ سنج تھے، انھوں نے درس نظامی کی تکمیل اپنے والد اور خاندان کے دوسرے بزرگوں مولانا حکیم علی نعمت اور مولانا محمد منظور احمد رحمہ اللہ سے کی تھی، اور کچھ عرصہ[1] تک متوسطات کی کتابوں کا درس بھی دیا تھا، ان کے والد مولانا شاہ نذیر الحق فائز ایک وسیع الاستعداد

---

[1] خود علامہ تمنا کے ارشاد کے مطابق اور علامہ کے شاگرد مولانا اسد القادری کی تحریر کے مطابق درس و تدریس کا زمانہ چودہ پندرہ سال پر محیط ہے۔ اور اس دوران ابتدائی کتابوں سے انتہائی کتابوں تک سب کا درس دیا۔ (طاہر)

عالم تھے۔ فارسی میں فکر سخن کرتے تھے۔ ان کے کلام کا مجموعہ پروفیسر ڈاکٹر افضل امام صاحب نے مرتب کرکے شائع کیا ہے۔ مولانا عمادی کا ابتدائی تعارف بھی ایک شاعر کی حیثیت سے ہوا، ان کی شاعری زیادہ تر بلکہ تمام تر نعت نبوی پر مشتمل تھی، وہ فارسی اور اردو میں پرجوش اور پرکیف نعتیں کہتے تھے۔ نعتوں کے ضمن میں اصلاح و موعظت کے مضمون بھی بڑی خوبی سے نظم کرتے، ان کے شیخ طریقت اور استاد شاہ رشید الحق عمادی سجادہ نشین خانقاہ عمادیہ پٹنہ، جو ان کے آبائی رشتہ سے چچا بھی تھے۔
مولانا تمنا عمادی کو "حسان الہند" کہا کرتے تھے، چنانچہ ان کی نظموں کے ابتدائی مجموعے "حسان الہند علامہ تمنا عمادی مجیبی پھلواری" کے نام سے شائع ہوا کرتے تھے افسوس کہ ان سطور کی تحریر کے وقت ان کے اشعار کا کوئی مجموعہ نہیں ہے جو نمونہ کے طور پر پیش کیا جا سکے۔ البتہ چند متفرق اشعار جو حافظے کے گوشوں میں پراگندہ پڑے ہوئے ہیں ان کا یہاں درج کرنا نامناسب نہ ہوگا۔

حضرت جابر بن سمرہؓ کی ایک روایت شمائل ترمذی میں ہے کہ وہ ایک مرتبہ چاندنی رات میں حضور انور صلے اللہ علیہ وسلم کو یمنی چادروں میں ملبوس دیکھ رہے تھے کبھی وہ چاند کو دیکھتے اور کبھی حضور انور کو! اور کہتے کہ مجھ کو حضور انورؐ چاند سے زیادہ خوبصورت نظر آرہے تھے اس واقعہ کو مولانا تمنا عمادیؒ نے نظم کیا تھا! اس نظم کا ایک شعر یہ ہے۔

رات بھر کیوں نہ تجھے چاند میں دیکھا ہی کروں
ان کی صورت سے بہت ملتی ہے صورت تیری

شاعری ان کے فن عروض میں ماہرانہ دستگاہ کا نتیجہ تھی۔ مگر پھر بھی اکثر اشعار سلیس اور رواں ہوتے تھے مثلاً ایک نظم کا پہلا شعر ہے۔

شکوۂ احبابؔ جدا۔ شکوۂ اغیار جدا
میرے افسانے کے ہیں دو باب، ہر اک باب جدا

لہ یہ مصرعہ فی الحق مضمون نگار کے سہو قلم نے کچھ سے کچھ بنا دیا۔ شاید اصل مصرعہ یوں ہو۔ "شکوۂ غیر جدا، شکوۂ احباب جدا"

ان کی شاعری کا اصلی رنگ فارسی میں کھلتا تھا۔ ایک مشہور زمین میں ان کے یہ دو شعر سنئے۔

حاشا کہ دل از ناوکِ جاناں گلہ دارد ٭ برباد سرائے کز مہماں گلہ دارد
دیوانہ بکار است چہ داد نہ زدستش ٭ داماں گلہ دارد کہ گریباں گلہ دارد

مولانا تمنا عمادیؒ کے شاگردوں کی تعداد خاصی تھی جن میں بعض بہت کامیاب شعرا بھی رہے ہیں جیسے نجم، ارمان اور شفیع تمنائی پھلواروی، ان کے علاوہ خاندان کے اکثر و بیشتر نوجوان جن کے اندر شاعری کی امنگ پیدا ہوئی، مولانا سے رجوع کرتے تھے۔ مگر شعر و ادب سے دلچسپی جوانی ہی کی عمر میں کم ہو گئی تھی، علمی و تحقیقی معروفیات نے اس ذوق پر غلبہ حاصل کر لیا تھا لیکن شعر و ادب سے وہ کلیۃً مستغنی نہیں ہوئے تھے، اپنے وسیع اور عالی شان مکان کا نام انھوں نے "دارالادب" ہی رکھا تھا جو ان کی ہجرت پاکستان کے بعد دوسروں کے قبضے میں آیا مگر اس کے دروازوں کا کتبہ اب بھی باقی ہے۔

وہ خاندانی صوفی تھے، تصوف کی گودوں میں پلے تھے، ان کے جد امجد (چھٹی پشت کے دادا) حضرت تاج العارفین شاہ محمد مجیب اللہ رحمۃ اللہ علیہ تھے جن کے اخلاف کی دو خانقاہیں پھلواری اور پٹنہ میں موجود ہیں۔ ان کی خانقاہوں کے "رسوم و آداب" نہ خالص دیوبندی طرز کے ہیں نہ بریلوی انداز کے، ان دونوں کے درمیان ایک معتدل اور متوسط انداز کی رسمیں وہاں رائج ہیں جن میں رسم سماع بھی شامل ہے۔ مولانا تمنا عمادی ان مروجہ مراسم تصوف سے گہرا تعلق رکھتے تھے۔ ذکر، شغل، مراقبہ، قبور سے لے کر حال قال میں کسی سے پیچھے نہیں تھے۔ لیکن کچھ عرصہ کے بعد ان مراسم سے دل برداشتہ ہو گئے بلکہ ان کے سخت مخالف ہو گئے۔ اس تبدیلی کا سبب خواہ کتاب و سنت کے مطالعہ کا خاص انداز رہا ہو یا کوئی دوسرا نفسیاتی سبب اس کا تعین دشوار ہے[1]۔ بہرحال یہ باتیں راقم الحروف

[1] خود علامہ تمنا کے ارشاد کے مطابق (جیسا کہ مولانا ظفر احمد عثمانی کے نام خط میں انھوں نے تحریر کیا ہے) تصوف اور اس کی رسوم علامہ کے بُعد کی وجہ کتاب اللہ، سیرت رسول اللہ اور سیر اصحاب رسول اللہ کا غیر جانبدارانہ مطالعہ تھا۔ ورنہ ظاہر ہے ایک خاندانی پیر گھرانے کے فرد کے لئے صوفیانہ رسوم سے فائدے ہی فائدے تھے۔ (ناشر)

کے وجود سے پہلے کی ہیں۔ اس لئے ان پر رائے زنی آسان نہیں ہے کہ تصوف سے انحراف و انکار کا باعث کیا تھا۔ البتہ جو چیز ہوش سنبھالنے کے بعد دیکھی اور سنی وہ یہ تھی کہ مولانا تصوف، خانقاہ اور خانقاہیت کے شدید منکر تھے۔ وہ اپنے گھر پر ہر جمعہ کو درس قرآن کا جلسہ کیا کرتے تھے۔ قرآن کریم سے ان کو شغف تھا، عربی لغت و نحو پر ان کو عبور کامل تھا تفسیروں پر نظر تھی۔ تصوف پر جب وہ نکیر کرتے تو کہا کرتے تھے کہ مجھے یہ الزام نہیں دیا جاسکتا کہ ؎ لذت ایں بادہ ندانی بخدا تا نہ چشی

تصوف کے انکار سے ان کے اندر ایک ذہنی انقلاب پیدا ہوا۔ انھوں نے اپنی عمر میں بار بار رائے نہیں بدلی۔ یہی ایک تبدیلی تھی جو اول و آخر ہوئی مگر اس کے نتائج بہت دور رس اور بعد میں تکلیف دہ حد تک غلو کی شکل میں نمایاں ہوئے۔ پہلا نتیجہ تو یہ نکلا کہ وہ تحقیق میں تقلید سے آزاد[1] ہوگئے وہ مسائل میں تحقیق کے وقت براہ راست قرآن و احادیث اور زیادہ تر قرآن کریم سے استشہاد کرتے۔ ائمہ مجتہدین اور ان کے پیرو بزرگوں کے اقوال ان کے لئے دلیل کا درجہ نہیں رکھتے تھے۔ دوسرے الفاظ میں آپ یوں کہہ سکتے ہیں کہ وہ اپنے مقالات میں حوالے کبھی ثانوی ماخذ ——————

(SECONDERY SOURCES) کے نہیں دیتے تھے۔ انکار تصوف کا دوسرا نتیجہ یہ ظاہر ہوا کہ تصوف کے "سلسلۃ الذہب" سے ان کے اندر ایک کد پیدا ہوگئی اور مناظرانہ جوش میں وہ حضرت سیدنا علی کرم اللہ وجہہ اور خاندان رسالت کے افراد پر اس طرح تنقید کرتے جس طرح شیعہ سنی مناظرہ کرنے والے بعض اہل سنت علماء کرتے ہیں بلکہ ان سے بھی دو قدم آگے[2]۔

---

[1] یہ نتیجہ تو بہت مبارک تھا اسے "تکلیف دہ حد تک غلو" کہنا بڑی زیادتی ہے۔ تحقیق حق میں اگر کوئی شخص اپنے خاندانی یا علمی کابر یا فرقہ کی تقلید سے آزاد نہ ہو تو وہ تحقیق کر ہی نہیں سکتا۔ (طاہر)

[2] علامہ تمنا خود محترم مقالہ نگار کے ارشاد کے مطابق حضرت فاطمہؓ کی اولاد سے تھے یعنی ہندی محاورہ کے مطابق سید تھے لہذا حضرت علیؓ اور حضرت حسینؓ ان کے جد امجد تھے۔ پھر صحابی تھے اور علامہ کا مسلک تو از اول تا آخر اسوہ صحابہ کی تبلیغ تھا جسے وہ قرآنی اصطلاح میں سبیل المؤمنین کہا کرتے تھے اور اس عنوان پر انھوں نے ایک ضخیم کتاب بھی لکھی ہے۔ لہذا اگر وہ صحابہ کرام کی اکثریت کے مقابلہ میں اپنے اجداد کی ایک آدھ خطائے اجتہادی کا اعتراف کرتے تھے تو یہ تو ان کی حق شناسی کا بہت بڑا ثبوت ہے نہ کہ تکلیف دہ حد تک غلو کا

غالباً یہی رگ تھی جس نے ان کے قلم سے محمود عباسی کے ان خرافات کی بھی تائید کرادی۔ جن پر تحقیق کا لیبل علم پر ایک بدترین تہمت[1] ہے۔ جس میں کھلا دجل، عبارتوں کی قطع و برید، غلط انتساب سب کچھ ہے۔

وہ حدیث کے منکر نہیں تھے۔ یہ ان پر اتہام ہے۔ وہ نام نہاد اہلِ قرآن کی طرح علم حدیث سے کورے نہیں تھے۔ بلکہ رجال احادیث پر ان کا اتنا بڑا کام ہے جس کی نظیر بہت سے شیخ الحدیثوں کے یہاں نہیں مل سکتی، وہ صرف یہ کہا کرتے تھے کہ حدیثیں قرآن کی ناسخ نہیں ہوسکتیں اور جو حدیثیں نص قرآن سے متعارض ہیں وہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی حدیثیں نہیں ہوسکتیں۔ مگر ہند و پاک کے اس گروہ نے جو اپنے آپ کو اہلِ قرآن کہتا ہے، مولانا کی تحریروں سے خوب خوب فائدہ اٹھایا۔ احادیث کے متون اور رجال سند کی بحثیں جن کا جائزہ لینا ان کے بس میں نہ تھا اس کام کو مولانا عمادی انجام دیا کرتے تھے اس میں ان کی تائید کے پہلو مل جاتے، اُس کو اجاگر کرکے پیش کرتے، اس طبقہ کے اس طرز عمل نے مولانا کو کئی نقصان پہنچائے۔ ایک طرف تو مدارس کے علماء نے ان کو بھی

(بقیہ ۔۔۔ کا حاشیہ) اگر ام المؤمنین حضرت عائشہ صدیقہ۔ حواری رسول حضرت زبیرؓ اور حضرت معاویہؓ اور حضرت عمرو بن العاصؓ کی خطاء اجتہادی پر زور دینا اور اس کا پروپیگنڈہ کرنا بلکہ اسے عقیدہ بنا لینا جرم نہیں ہے تو حضرت علیؓ و حضرت حسینؓ کی کسی خطاء اجتہادی کا قائل ہونا جرم کیوں ہو؟ کیا ام المؤمنین حضرت عائشہؓ صدیقہ اور حواری رسول حضرت زبیرؓ کی خطائے اجتہادی کا تذکرہ کرنے والے بھی "تکلیف دہ حد تک غلو" کے مرتکب کہلائیں گے یا ان کے خطاء اجتہادی کا تذکرہ کرنا جرم نہیں ہے؟ حضرت! اگر اصول ہو تو سب کے لئے یکساں ہونا چاہئے۔ ورنہ صحابہ کرام میں سے کچھ کے لئے معیار جدا ہو اور کچھ دوسروں کے لئے جدا معیار ہو یہ طرز عمل اصول اور عدل کے خلاف ہے اور فی الحقیقت "تکلیف دہ حد تک غلو" یہ طرز عمل ہے نہ کہ علامہ تمنا کی اصول پسندی جس کی وجہ سے تمام صحابہ کرام کو ایک نظر سے دیکھا جاتا ہے۔ (طاہر)

[1] محترم مقالہ نگار کا یہ فیصلہ بھی انتہاپسندانہ ہے۔ عباسی مرحوم کی یہ کتاب نہ اس قدر بری ہے جیسا کہ مقالہ نگار کا ارشاد ہے۔ نہ ایسی غیر معمولی جیسا کہ اس کتاب کے معتقدین سمجھتے ہیں۔ اگر محترم مقالہ نگار اس کتاب کو اس حد تک بدترین سمجھتے ہیں تو انہیں کسی مختصر مقالہ ہی میں بھی اس کتاب کی علمی تنقید کرنی چاہئے تھی۔ جذباتی انداز کے الزامات نامناسب ہیں۔

پرویز جیسا مدعی علم سمجھ لیا اس لئے ان کی باتوں کو قابل توجہ نہیں سمجھا اور کبھی ان کا نام بھی لیا تو اسی انداز سے جس طرح پرویز صاحب کا نام تحقیر و استخفاف کے ساتھ علمی و دینی حلقوں میں لیا جاتا ہے۔

دوسری طرف ان محمود عباسیوں، پرویزیوں اور اہل قرآنوں نے مولانا تمنا کی مکمل بات سامنے نہیں آنے دی۔ چند ماہ پہلے ماہنامہ فاران میں مولانا تمنا کا ایک مضمون شائع ہوا تھا جس میں انھوں نے اس مظلومیت کا اظہار کیا تھا۔

عالم با عمل | بہرحال اپنے "موتی" کا ذکر خیر کرنا چاہئے، ان کی خاص بات جس کی شہادت ان کے انتقال کے بعد دی جا سکتی ہے اور جس کی شہادت میں صرف اللہ تعالیٰ کی رضا مقصود ہے وہ یہ ہے کہ وہ مخلص اور سچے مسلمان تھے، انھوں نے جو کچھ لکھا اور کہا وہ ان کے ضمیر کی آواز تھی اور ان کی تحقیق کا نتیجہ تھا، انھوں نے اپنے نظریہ کے تحت (کسی یافت کے لئے نہیں) اپنا جما جمایا گھر بیک بینی اور عزت کی زندگی، خوشحالی اور فارغ البالی کی معیشت کو چھوڑ کر ــــــ مشرقی پاکستان میں ہجرت کی، اپنے اعزہ اور خاندان کے افراد جن کی بے پناہ محبت ان کے دل میں تھی اور جن کے نازک سے نازک جذبات کا وہ احترام کرتے تھے۔ ان سب کی بے رُخی مول لی، ان کے اخلاص و صداقت کا ایک نمونہ یہ ہے کہ انھوں نے اپنی دو بیٹیوں کی شادی ایسے خاندان میں کر دی جس کو بہار کی ہندوانہ معاشرت سے متاثر مسلم معاشرہ نسبی اعتبار سے پست سمجھتا تھا، اور خاص طور سے "پھلواری" کے مشائخ کا خاندان جو اس کو "ناک کٹانے" کے مرادف سمجھتا تھا، وہاں انھوں نے کسی تنقید کی پرواہ نہ کی، یہ کوئی معمولی بات نہ تھی۔ یہ اقدام وہی کر سکتا تھا جس کو اپنے عقائد پر اطمینان کامل ہو، لوں وعظ کہنا اور مضمون لکھ دینا آسان ہے مگر عملی اقدام وہی کر سکتے ہیں جو اولوالعزم ہوں!

ان کا دوسرا وصف یہ تھا کہ وہ عمر بھر ایک نہ تھکنے والے محنتی طالب علم رہے۔ اپنے ہوش سنبھالنے سے لے کر بستر مرگ تک جبکہ ان کو اپنی موت صاف نظر آ رہی تھی علمی تحقیق و جستجو میں مصروف رہے، راقم الحروف کے پاس ان کا آخری خط نومبر کی کسی تاریخ کا ہے انتقال سے

دس پندرہ روز پہلے لکھا تھا۔ اس کی ابتدا اس طرح کی تھی کہ یہ خط اپنے بستر مرگ سے لکھ رہا ہوں' اس خط میں بھی قرآن کریم کے چند الفاظ اور ان کی تعبیر پر تحقیقات کا مفصل ذکر تھا۔ ان کے اس خط کو پڑھ کر مجھے ایک بزرگ عالم کا واقعہ یاد آیا کہ انھوں نے اپنے آخری لمحات زندگی میں کسی سے فرائض کے ایک مسئلہ کو دریافت کیا' لوگوں نے کہا یہ آپ کا آخری وقت ہے اس وقت آپ یہ معلوم کر کے کیا کریں گے انھوں نے جواب دیا کہ کسی شے سے واقف ہو کر مرنا زیادہ بہتر ہے بہ نسبت اس کے کہ جاہل رہ کر مروں!

مولانا تمنا عمادی مجیبی ۱۳۰۵ھ میں ایک کھاتے پیتے گھرانے میں پیدا ہوئے اور ۱۳۹۲ھ میں کراچی میں مسافرانہ بیکسی کی حالت میں فوت ہوئے حق تعالیٰ جل شانہ کی شانِ رحمت جو مغفرت کے لئے بہانہ ڈھونڈتی ہے ان کو بخش دے۔ (آمین)

(ماہنامہ فاران کراچی" مارچ ۱۹۷۲ء صفحہ ۹۶)



مسند احمد کی حقیقت

قصہ پرداز راویوں نے نہ صرف یہ کہ ہزاروں جعلی حدیثیں گھڑیں، غضب یہ ہے کہ بعض دیدہ دلیروں نے ہزاروں صفحات کی پوری پوری کتابیں گھڑ کر اکابر آئمہ امت کے نام منسوب کرکے مشہور کر دیں ان میں سے ایک جعلی کتاب مسند احمد جو دس جلدوں میں تیس چالیس ہزار کے قریب روایات کا سمندر ہے۔ یوں تو حدیث کی کئی کتابیں متاخرین نے خود جمع کیں اور ان کو اگلے بزرگوں میں سے کسی کے نام کے ساتھ منسوب کر دیا۔ جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ عوام تو عوام ہیں بعض خواص بھی کچھ دنوں کے بعد اس نسبت سے دھوکا کھا گئے اور اس کتاب کو انھیں بزرگ کی تالیف سمجھنے لگے۔ جن کی طرف اس کی نسبت کر دی گئی۔ مثلاً حافظ ابن حجر نے تعجیل المنفعۃ کے دیباچہ میں لکھا ہے کہ محمد بن علی بن حمزہ الحسینی نے مسند امام شافعیؒ اور مسند امام ابی حنفیہؒ کا ذکر اس طرح کیا ہے، جس سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ ان کتابوں کو ان بزرگوں کی خاص تالیف سمجھتے تھے۔ حالانکہ مسند شافعی کو بعض نیشاپوریوں نے کتاب الام وغیرہ سے اور بعض حدیثیں ابو العباس الاصم سے لیکر جن کو وہ تنہا ربیع بن سلیمان سے روایت کرتے تھے۔ ایک مسند شافعی مرتب کر رکھی تھی۔

اسی طرح امام ابو حنیفہؒ کے تین سو برس بعد ان سے منسوب روایات کو ابو محمد الحارثیؒ نے امام ابو حنیفہؒ ہی کے شیوخ پر مرتب کرکے ایک مجموعہ تیار کیا اور اس کا نام مسند ابی حنیفہ رکھ دیا۔ اس کے بعد اسی میں سے مرفوع حدیثیں چن کر ابو بکر بن المقری نے ایک مختصر سی مسند ابی حنیفہ مرتب کی۔ مسند حارثیؒ ہی کی طرح ابن خسرو نے بھی ایک مسند

ابی حنیفہ جمع کی جو کافی مشہور ہے اور سب سے آخر میں خوارزمی نے ایک ضخیم جامع المسانید مرتب کر ڈالی، جو انگی کتابوں کی جامع ہے۔

تو جب ابن حمزہ الحسینی جیسے محدث ماہر رجال، جو ابن حجر سے بھی متقدم تھے صرف نسبت کی وجہ سے دھوکا کھاگئے تو۔ تابد یگراں چہ رسد مگر یہ جامعین مسند چونکہ امام شافعیؒ و امام ابو حنیفہؒ سے بہت زیادہ متاثر تھے اور پھر ان کی یہ جمع و تالیف کسی خاص اجتماعی سازش کے ماتحت نہ تھی بلکہ مختلف اشخاص کی الگ الگ کوشش تھیں اور ہر مؤلف کی کوشش خاص اپنے ہی فرقہ کی تائید میں تھی، جس کی وجہ سے دوسرے فرقہ والوں نے ان کتابوں کی نسبتوں کو صحیح ثابت نہ ہونے دیا اور خود اس فرقہ کے ثقہ لوگوں نے بھی دوسروں کی تکذیب کی تائید کی، جیسا کہ ابن حجر نے خود اعتراف کیا کہ مسند شافعی امام شافعیؒ کی تالیف نہیں بلکہ ان سے منسوب روایات کو ان کے بہت بعد بعض نیشاپوریوں نے مسند شافعی کے نام سے جمع کیا ہے۔

بخلاف مسند امام احمد کے کہ یہ ایک خاص اجتماعی سازش کے ماتحت جمع کی گئی اور اس کے جامعین کی غرض ہی یہی تھی کہ اس کو جس طرح بھی ہو خاص امام احمد کی تالیف ثابت کرکے رہیں اور اس کا اہتمام امام احمد کی وفات کے کچھ بعد ہی سے نہیں بلکہ عجب کیا ہے کہ ان کی گوشہ نشینی کے وقت ہی سے اس کی تالیفی داغ بیل ڈال دی گئی ہو۔ واللہ اعلم بالصواب۔ مسند امام شافعی کی جامع کی غرض اس کتاب سے مسلک امام شافعی کی تائید تھی اور مسند امام ابی حنیفہ کے جامع کی غرض اس کتاب سے مذہب امام ابو حنیفہ کی تائید تھی، اس لئے ان میں سے ہر ایک میں اپنے اپنے رنگ کی حدیثیں جمع کی گئی تھیں۔

مگر مسند احمد میں مسلک امام احمد کے موافق و مخالف ہر طرح کی رطب و یابس روایتیں جمع کر دی گئی ہیں اور اتنا بڑا ذخیرہ جمع کر دیا گیا ہے کہ ہر فرقہ کے موافق بھی کچھ حدیثیں اس میں ملتی ہیں اور مخالف بھی۔

مسند شافعی سے صرف شوافع ہی فائدہ اٹھا سکتے ہیں اور مسند ابی حنیفہ سے صرف احناف ہی کام نکال سکتے ہیں۔ دوسرے فرقے والے ان کتابوں سے بہت کم مستفید ہوسکتے ہیں۔ مگر مسند احمد سے جس طرح حنابلہ مستفیض ہوتے ہیں بالکل اسی طرح شوافع و احناف و مالکیہ بھی۔ اور صوفیہ اور شیعہ کے لئے تو یہاں خزانے کا دروازہ کھلا ہوا ہے۔ یہاں تک کہ زنادقہ و ملاحدہ بھی اس کی بارگاہ سے محروم نہیں جاسکتے۔

عزازیل گوید نصیبے برم

یہی وجہ ہے کہ مسند شافعی سے احناف کو اختلاف ہو سکتا ہے اور ہے۔ مسند ابی حنیفہ پر شوافع وغیرہم طعن کر سکتے ہیں اور کرتے ہیں۔ مگر مسند احمد کی پالائش سب کے سب کر رہے ہیں ۔کیونکہ یہ مجموعہ کل حزب بمالدیھم فرحون کی ایک عجیب و غریب تماشا گاہ ہے۔ مسند احمد میں چونکہ ہر فرقے کے موافق بھی روایتیں ہیں اور مخالف بھی، اس لئے ہر فرقہ اس کی بعض حدیثیں لینے کے لئے جس طرح ہاتھ بڑھانا چاہتا ہے اسی طرح بعض کی طرف سے ہاتھ کھینچ بھی لیتا ہے اس کے لئے بات یوں بنائی جانے لگی کہ اس میں کچھ تو حدیثیں خاص امام احمد کی ہیں، وہ تو بالکل صحیح ہیں اور کچھ امام احمد کے صاحبزادے عبداللہ کے اضافے ہیں۔ ان میں کچھ ضعیف حدیثیں بھی ضرور ہیں اور کچھ حدیثیں عبداللہ بن احمد کے شاگرد ابو بکر قطیعی کی بڑھائی ہوئی ہیں۔ جن میں ضعیف ہی نہیں

بلکہ کچھ موضوعات بھی ہیں۔ اس تقسیم کے بعد ہر فرقے کو اس کا موقع مل جاتا ہے کہ جو حدیث اس کے موافق اس ذخیرہ میں ملتی ہے، اس کو وہ خاص امام احمد کی حدیث بتاتا ہوا اس کو دانتوں سے پکڑلیتا ہے۔ اور جو حدیث اس کے مخالف ملتی ہے اس کو عبداللہ کے زیادات یا ابو بکر قطیعی کے اضافے قرار دیکر رد کر دیتا ہے۔

رجال کی چھان بین کرنے والوں کی کافی تعداد دوسری صدی کے اواخر ہی سے پیدا ہو چکی تھی اور یہ فن روز افزوں ترقی پر مدتوں تک رہا۔ مگر باوجود کافی تفحص اور قابل رشک دیانت داری کے مسلکی رجحانات سے آئمہ رجال بھی محفوظ نہ رہ سکے۔ اور جس طرح امام مالک و امام احمد اور بخاری و مسلم کے شیوخ سے جہاں تک ہوسکا چشم پوشی سے کام لیا گیا۔ اسی طرح ایسے لوگوں کے متعلق بھی عفوو درگذر سے حتی الوسع کام لیا گیا جن سے روایات کا کوئی خاص مقصد وابستہ تھا۔ مثلاً حفص و حمزۂ زیات وغیرہما جیسوں کے احکام و سنن کی کبھی کوئی روایت معتبر نہیں سمجھی گئی، مگر اختلاف قرأت کی روایتیں ضرور ان سے لے لی گئیں، ورنہ وہ قرأتیں جو ان سے مروی ہیں معدوم ہو جاتیں اور ان کے معدوم ہونے سے قاریوں کے نزدیک قرآن کا ایک حصہ ہی معدوم ہو جاتا۔

اسی طرح سُدّی و کلبی وغیرہما کہ ہرچند احکام و سنن میں ان جیسوں کی کوئی روایت مقبول نہیں ہوئی۔ کیونکہ یہ لوگ بالاتفاق وضاع و کذاب ہیں۔ مگر تفسیری روایتیں کم سے کم پچانوے فیصدی انہیں جیسوں سے مروی ہیں۔ اگر ان لوگوں کو نامعتبر قرار دے کر ان کی تفسیری روایتیں رد کر دی جائیں تو پھر یہ تفسیر کا ذخیرہ تو بالکل غائب ہی ہو جائے گا۔

بالکل اسی طرح مسند احمد کے دو راوی ابو بکر قطیعی جو مسند کی روایت عبداللہ بن امام احمد سے تنہا کر رہے ہیں اور ابن المذہب جو ابو بکر قطیعی سے تنہا سند کی روایت کرتے ہیں۔ اگرچہ یہ دونوں غیر متقن اور حقیقۃً ناقابل اعتبار ہیں مگر ان کو ناقابل اعتبار قرار دے کر ان کے واسطے سے جو مسند احمد کا ذخیرہ مل رہا ہے اس کو غیر مستند سمجھتے ہوئے محدثین رد کر دیتے تو پھر ایسی نعمت عظمیٰ جس سے ہر فرقہ کا کام نکل رہا ہو کہاں ملتی، اس لئے جس طرح قرأت کے لئے حفص و حمزہ کو گلے لگانا پڑا اور تفسیری روایتوں کی خاطر سدی و کلبی کے سامنے زانوئے ادب تہ کرنے کو گوارا کیا گیا۔ اسی طرح مسند احمد کی ضرورت نے ابو بکر قطیعی و ابن المذہب کی پالائش کرنے پر محدثین و ائمہ رجال کو مجبور کر دیا۔

پھر متقدمین نے کم از کم اتنا تو اعتراف کیا تھا کہ اس انبار روایات میں بعض موضوع روایتیں بھی ہیں مگر وہ صرف ابو بکر قطیعی کے اضافے والی روایتیں ہیں۔ چنانچہ ابن[1] جوزی و علامہ عراقی[2] نے مثلاً بعض روایتوں کو موضوع قرار دے کر پیش بھی کیا تھا مگر بعد والے اس مسند کے ساتھ اس قدر غلو پیدا کر چکے تھے کہ اس کو بھی برداشت نہ کر سکے کہ ابو بکر قطیعی پر الزام رکھتے ہوئے بھی اس کتاب میں کسی موضوع حدیث کا وجود تسلیم کیا جائے۔ چنانچہ حافظ ابن حجر متوفی ۸۵۲ھ جو خود اپنی

۱۔ ابو الفرج عبد الرحمن بن علی الجوزی ولادت ۵۰۸ سے ۵۱۰ھ تک کے اندر وفات ۵۹۷ھ

۲۔ حافظ زین الدین عبد الرحیم بن الحسین العراقی ولادت ۷۲۵ھ۔ وفات بروایت صحیح ۸۰۶ھ ان کی کتاب "الفیۃ الحدیث" مشہور و معروف ہے۔

کتاب لسان المیزان جلد ۲ صفحہ ۱۳۷ میں ابن المذہب ہی کے ترجمے کے آخر میں ابن المذہب اور ان کے شیخ ابو بکر قطیعی دونوں کو غیر متقن قرار دیتے ہوئے امام ذہبی کا قول نقل کر رہے ہیں کہ "اسی لئے مسند احمد میں ایسی ایسی چیزیں واقع ہوگئیں جن کی نہ تو متن ہی محکم ہے نہ اسناد ہی" انھیں ابن حجر نے ابن جوزی و عراقی کے جواب اور مسند احمد کی حمایت میں ایک کتاب لکھ ڈالی جس کا نام القول المسدد فی الذب عن مسند احمد ہے اس میں ان تمام حدیثوں کو جنھیں ان دونوں میں سے کسی ایک نے بھی موضوع قرار دیا تھا، صحیح نہیں بلکہ بعض کو تو متواتر یا قریب متواتر تک بزعم خود ثابت کر دکھایا ہے۔

اخی المکرم مولانا عبید اللہ الانجری مدرس سینیر مدرسہ شمس الہدیٰ پٹنہ رحمۃ اللہ علیہ کے سامنے برسبیل تذکرہ ابن حجر کی اس بے جا حمایت کا ذکر کیا تو انھوں نے مجھ سے کہا کہ آپ ان میں سے کسی ایک حدیث کو بھی اب پھر کوشش کر کے موضوع ثابت کر دیجئے اور ابن حجر کے دلائل کو باطل کر دکھایئے تو میں جانوں۔ میں نے ان کی خدمت میں عرض کیا کہ "آپ ہی ان میں سے کسی ایک حدیث کو چن دیجئے"۔ بھائی صاحب مرحوم و مغفور نے سد وا ابواب المسجد الا باب علی والی حدیث پیش کی کہ اس کو ابن جوزی و عراقی دونوں ہی نے موضوع قرار دیا ہے اور ابن حجر نے اس کی تصحیح کرتے ہوئے اس کو قریب بمتواتر دلائل قاطعہ و براہین ساطعہ سے ثابت کر دکھایا ہے۔ آپ ابن حجر کے دلائل کو غلط ثابت کر کے اس حدیث کو واقعی موضوع اور حقیقتاً شیعوں کا افترا ثابت کر دکھایئے۔ بتوفیقہ تعالیٰ میں نے ایک ہفتہ کے اندر خود ابن حجر ہی کی کتابوں سے ابن حجر کے اقوال و دلائل کی دھجیاں اڑا کر رکھ دیں اور

دکھا دیا کہ یہ حدیث در حقیقت موضوع ہی ہے۔ بھائی صاحب ممدوح میرے مختصر سے رسالے کو دیکھ کر بہت خوش ہوئے۔ اور بڑی داد دی اور ابن حجر کی اس بے جا حمایت پر سخت متاسف ہوئے۔ رحمهم الله تعالیٰ و عفا عنهم۔

اسناد مسند احمد

اس مسند کے اسناد جہاں کہیں ملتے ہیں اسی سلسلۂ روایت سے ملتے ہیں کہ صرف حنبل بن عبداللہ الرصاقی سے اس مسند کو لوگ روایت کرتے ہیں اور حنبل بن عبداللہ الرصافی تنہا اس کی روایت شیخ ابوالقاسم ہبۃ اللہ بن محمد بن عبدالواحد[1] ابن احمد بن الحسین الشیبانی سے کرتے ہیں اور وہ تنہا ابو علی الحسن بن علی بن محمد التمیمی الواعظ عرف ابن المذہب سے۔ وہ تنہا ابو بکر احمد بن جعفر بن حمدان بن مالک القطیعی سے۔ وہ تنہا عبداللہ بن الامام احمد سے۔ وہ تنہا اپنے والد ماجد امام احمد بن محمد بن حنبل سے یعنی پانچ نسلوں تک اس مسند کو صرف ایک ایک راوی ہی روایت کرتے رہے ہیں۔

مسند احمد کے تمام قدیم و جدید، قلمی و مطبوعہ نسخوں کو دیکھ لیجئے۔ بسم اللہ کے بعد ہی اس کا آغاز اخبرنا سے ہوتا ہے۔ یہ اخبرنا کہنے والے کون ہیں اللہ ہی کو معلوم ممکن ہے کہ اس جمع یا تثنیہ متکلم میں حنبل بن عبداللہ الرصافی بھی ہوں۔ مگر حنبل بن عبداللہ الرصافی اور ابو القاسم ہبت اللہ کا حال مجھ کو باوجود جستجو کے رجال کی کسی کتاب میں کہیں نہیں

۱۔ مسند کے موجودہ مطبوعہ مصری نسخے میں یہاں پر عبدالواحد کی جگہ عبدالوہاب لکھا ہوا ہے مگر جہاں تک میں نے تحقیق کی صحیح عبدالواحد ہی ہے۔ واللہ اعلم

ﷺ۔ ممکن ہے کہ طبقات الحنابلہ وغیرہ میں کہیں مذکور ہوں۔ مگر اتنا ضرور ہے کہ حنبل بن عبداللہ اور ابو القاسم ہبت اللہ ان دونوں کے نام صرف اسی مسند ہی کے سلسلۂ اسناد میں آتے ہیں۔ ان کے سوا اور کہیں بھی دیکھنے میں نہیں آتے۔ وفیہ مافیہ۔

بہرکیف ان کے بعد ابن المذہب ہی کا نام آتا ہے تو اب ابن المذہب کا حال سنیے۔

ابن المذہب

ابوالقاسم ہبۃ اللہ کے شیخ ابن المذہب یعنی الحسن بن علی بن محمد ابو علی بن المذہب الواعظ التمیمی البغدادی۔ ابوالقاسم ہبت اللہ کی طرح یہ واحد راوی اس پورے ذخیرۂ روایات یعنی مکمل مسند احمد کے ہیں۔ یہی تنہا اس مسند کی روایت ابو بکر قطیعی سے کرتے ہیں اور ابو بکر قطیعی، عبداللہ سے، وہ اپنے والد امام احمد سے۔

امام ذہبی میزان الاعتدال میں اور ابن حجر لسان المیزان میں ان کا مفصل حال لکھتے ہیں۔ دونوں ہی ان کے متعلق خطیب بغدادی کا قول نقل کرتے ہیں کہ ابن المذہب کا ابو بکر قطیعی سے مسند احمد کا سننا تو صحیح[ؔ] ہے مگر پوری کتاب کا نہیں کیونکہ بعض اجزاء کا سننا ثابت نہیں۔ مگر ابن المذہب نے ان غیر مسموعہ اجزاء کو بھی مسموعہ کے ساتھ ملا لیا تھا اور امام احمد کی کتاب الزہد کو دیکھ کر اس کی بھی روایت کرنے لگے۔

ؔ۔ اگر ذہبی و ابن حجر اتنا لکھیں اور اس سماعت کی صحت تسلیم نہ کریں تو پھر مسند احمد کا وجود ہی ناقابل ثابت ہو جاتا ہے۔ اس لئے اتنا اعتراف مجبوراً ضروری تھا۔ اس کے بعد مگر پوری کتاب کا نہیں " یہ فقرہ بے لوثی و حق گوئی ثابت کرنے کے لئے لکھ دینا لازمی تھا۔

حالانکہ اس کا اصل نسخہ ان کے پاس نہ تھا۔ خود اپنے ہی ہاتھ سے لکھے ہوئے نسخے سے روایت کیا کرتے تھے۔

ذہبی و ابن حجر لکھتے ہیں کہ ابن المذہب ۳۵۵ھ میں پیدا ہوئے اور نواسی سال کی عمر پاکر ۴۴۴ھ میں وفات پائی۔ مسند فضالہ بن عبید اور مسند عوف بن مالک ابن المذہب کے نسخہ مسند میں نہ تھے۔ اسی طرح مسند جابر کی وہ بعض حدیثیں بھی نہ تھیں، جن کو حرانی[۱] نے قطیعی سے روایت کیا ہے۔

پھر حافظ ابن حجر، امام ذہبی کا معترفانہ اعتراض نقل کرتے ہیں کہ جب ایک شخص بتقلید خطیب کسی کتاب کی روایت کے سلسلے میں اپنا نام جوڑ سکتا ہے تو یہ جو کچھ ہم نے ذکر کیا ہے، یعنی مسند فضالہ و مسند عوف اور مسند جابر میں کی چند احادیث کا الحاق بھی (اپنی طرف سے کر لیا ہوگا۔")

اتنا لکھ کر پھر حافظ ابن حجر، امام ذہبی کا یہ قول بھی نقل کرتے ہیں کہ "شجاع ذہلی نے کہا ہے کہ ابن المذہب روایتوں میں معتمد علیہ نہ تھے۔

۱۔ اس کا اصل نسخہ دنیا میں کہیں نہ تھا۔ یہ پوری کتاب مجزدا ابن المذہب اور ان کے رفقاء کی تصنیف کردہ تھی، جس کو انہوں نے اپنے ہاتھ سے لکھ کر امام احمد کی طرف منسوب کر رکھا تھا۔ ابن حجر فرماتے ہیں "اس لئے وہ محل حجت نہیں" تو پھر اور کس کی روایت سے کتاب الزہد محل حجت ہو سکے گی؟ دنیا میں ہے کوئی؟ جو ابن المذہب کے علاوہ کسی اور کی روایت سے کتاب الزہد کو پیش کر سکے۔

۲۔ حرانی سے مراد ابو شعیب عبد اللہ بن الحسن الحرانی کے سوا اور کوئی دوسرا نہیں ہو سکتا۔ جیسا کہ خود ابن حجر اور ذہبی کی تصریحات سے ثابت ہے اور نہ کوئی دوسرا اس لقب کا ایسا ہے جس کو کہا جا سکے کہ شاید وہ ہو۔ تفصیل دیکھیے۔

سلفی نے کہا ہے کہ یہ ہمیشہ محل گفت گور ہے کتاب الزہد کے معدوم ہو جانے کے بعد بغیر اصل کتاب کے خود اپنے ہاتھ کے لکھے ہوئے نسخہ کتاب الزہد کی روایت کیا کرتے تھے۔ خطیب نے کہا کہ ابن المذہب نے ایک ایسی حدیث ابو بکر قطیعی سے روایت کی جس کو ان سے ہرگز نہیں سنا تھا۔

اس پر ذہبی نے ابن المذہب کی طرف سے یہ تاویل کی ہے کہ شاید وِجَادَۃ ' اجازت بنالی ہو (یعنی وہ حدیث کہیں قطیعی کے ہاتھ کی لکھی ہوئی دیکھی ہو۔ یا کسی اور جگہ قطیعی کی طرف منسوب نظر آئی ہو اور انہوں نے اسی پالینے کو اجازت قرار دیدی ہو۔ اور حدثنا ابو بکر القطیعی کہکر روایت کرنے لگے ہوں۔) توکیا یہ بھی جھوٹ نہ ہوا؟

پھر ابن حجر لکھتے ہیں ' خطیب بغدادی نے یہ بھی بیان کیا کہ ابن المذہب نے ہم لوگوں سے بواسطہ دار قطنی و وراق و ابو عمرو بن مہدی ایک مرتبہ ایک حدیث محاملی سے روایت کی۔ تو میں نے کہا یہ حدیث تو ابو عمرو بن مہدی کے پاس نہ تھی۔ تو ابن مذہب نے ابن مہدی کے نام پر ہاتھ مار کر کہا کہ بہتیری حدیثیں میرے سامنے پیش کی جاتی ہیں جن میں نام غیر منسوب ہوتے ہیں تو میں ان کو اپنی طرف سے منسوب کر لیا

۲۔ کتاب الزہد کا وجود ہی پہلے کہاں تھا کہ معدوم ہوتی اس کو تو نہاں خانہ عدم سے مصاحب وجود پر فریب ابن المذہب ہی پہلے پہل لایا۔ اگر اس کو اپنے نام سے پیش کرتا تو مانتا ہی کون؟ اس لئے بے چارے نے اس کو امام احمد کی طرف منسوب کر دیا۔

اتنی سی بات تھی جسے افسانہ کر دیا

ورنہ امام احمد کے بعد ان کی اس تصنیف سے ان کے تلامذہ نے ایسی بے اعتنائی کیوں برتی؟ اور یہ چیز معدوم کیوں اور کس طرح ہو گئی؟

کرتا ہوں، اس طرح اصل روایت میں وہ نسبت ملحق ہو جایا کرتی ہے۔

اتنا لکھ کر ابن حجر لکھتے ہیں کہ ابن مذہب کے ہم عصر ان کی ان حرکتوں کو بہت ناپسند کرتے تھے، مگر یہ کبھی ان حرکتوں سے باز نہ آئے۔[۵]

ان تمام باتوں کو لکھ کر آخر میں حافظ ابن حجر پھر ذہبی کا آخری قول نقل فرماتے ہیں کہ ان تمام باتوں سے یہ ضرور ظاہر ہوگیا کہ ابن المذہب ایک غیر متقن و آدمی تھے اور انھیں کی طرح ان کے شیخ (ابو بکر قطیعی) بھی ۔ اور اسی وجہ سے مسند احمد میں ایسی ایسی چیزیں واقع ہوگئیں جن کی نہ تو متن ہی محکم ہے نہ اسناد ہی واللہ اعلم (دیکھئے لسان المیزان جلد دو ۲ صفحہ ۱۳۷ و میزان الاعتدال جلد اول ۲۲۷)

یہی ابن المذہب ہیں جو ابن مالک ابو بکر القطیعی سے مسند احمد کے تنہا راوی ہیں ان کے سوا کوئی دوسرا راوی مسند احمد کا دنیا میں پیدا نہیں ہوا۔ امام ذہبی نے میزان الاعتدال میں اور ابن حجر نے لسان المیزان میں جو اتنا بھی ان کے متعلق لکھا ہے وہ بھی مجبوراً اس لئے کہ کہاں تک چھپاتے ۔ اور اگر ان کے تمام حالات واضح کر دیتے تو پھر مسند احمد کی کوئی حیثیت باقی نہ رہتی۔

ابھی ابھی ابن المذہب کے آغاز تذکرہ میں آپ نے پڑھا کہ ابن

ڈھوتے

۱۔ یہی وجہ ہے کہ باوجود اس کے کہ ابن المذہب، مسند احمد اور کتاب الزہد کو ڈھوتے پھرے، مگر بجز ابو القاسم ہبۃ اللہ کے ان کو اور کوئی ایسا نہ ملا جو ان سے مسند احمد یا کتاب الزہد کی سند لیتا۔ بادی النظر جس نے بھی الٹ پلٹ کر دیکھا، چیز اچھی نظر آئی اس لئے امام احمد کی نسبت کا اتنا ہی احترام کیا تو بہت کیا کہ ان کو زبان سے جھٹلایا نہیں مگر ہر شخص دل میں ضرور ان کتابوں کی طرف سے غیر مطمئن ہی رہا، ورنہ کچھ بھی وثوق اگر ہوتا تو خود خطیب بغدادی اور ان کے دوسرے ہم عصر مسند احمد اور کتاب الزہد کی سند ان سے ضرور لیتے ۔ امام احمد کی کتابیں ایسی نہیں ہو سکتی کہ خطیب جیسے حدیثوں کے رسیا ان کی طرف سے بے اعتنائی اور بے پروائی برتیں۔

المذہب کے نسخہ مسند احمد میں مسند جابر کی بعض وہ حدیثیں نہ تھیں جن کو حرانی نے قطیعی سے روایت کیا ہے۔ اس سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ ابوبکر قطیعی سے حرانی (یعنی ابو شعیب عبداللہ بن الحسن الحرانی) نے بھی مسند احمد کی روایت کی ہے تو قطیعی سے[1] مسند احمد کے تنہا راوی ابن المذہب نہ ہوئے بلکہ دوسرے راوی حرانی بھی ہیں۔ مگر یہ صحیح نہیں ہے اس طرح کے داؤ پیچ چالاک محدثین کو خوب آتے ہیں کہ بعض غلط باتیں ضمنی طور سے کسی دوسرے تذکرہ میں کہہ جاتے ہیں تاکہ خارج از بحث بات ہونے کی وجہ سے اس غلط بات کی تغلیط کی طرف کوئی توجہ نہ کرے اور اس طرح وہی غلط آئندہ کے لئے صحیح بن جائے۔ بعد کو جب بھی بات جو اس وقت خارج از مبحث ہے۔ خود موضوع بحث بنائی جائے گی تو یہ تحریر اس وقت ثبوت میں پیش کر دی جائے گی کہ فلاں جگہ اس کا ذکر آچکا ہے۔ اگر یہ بات غلط ہوتی تو اسی وقت اس کی تردید کی جاتی۔

حقیقت یہ ہے کہ حرانی کا ابوبکر قطیعی سے پوری مسند احمد یا اس کے کسی جزء کا بھی بلکہ کسی ایک حدیث کا بھی روایت کرنا کسی کتاب سے ثابت نہیں۔ خود ابن حجر لسان المیزان جلد ۳ صفحہ ۲۷۱ میں حرانی کا ترجمہ لکھتے ہیں مگر ان کے شیوخ میں ابوبکر قطیعی کا نام نہیں لکھتے اور نہ مسند احمد ہی کی روایت کا ذکر کرتے ہیں اور اس کی امید بھی نہیں کی جا سکتی کہ ایک تقریباً نوے[2] برس کا بوڑھا آدمی ایک بائیس برس کے چھوکرے

۱۔ تعجب ہے کہ امام ذہبی اور ابن حجر دونوں ہی ابن المذہب کو مسند احمد کا ابوبکر قطیعی سے تنہا راوی بھی لکھتے ہیں، پھر حرانی کو بھی قطیعی سے مسند احمد کا راوی بتاتے ہیں۔ اگر دونوں قطیعی سے مسند کی روایت کرتے تھے تو پھر ابن المذہب تنہا راوی کس طرح ہوئے؟

۱۔ ابو شعیب الحرانی کے متعلق ابن حجر لسان المیزان میں لکھتے ہیں کہ یہ ۱۵۶ھ میں پیدا ہوئے اور ۲۹۵ھ میں ۸۹ برس کی عمر پا کر وفات پائی۔ ظاہر ہے کہ اس حساب سے ان کی عمر ۸۹ نہیں ہوتی

سے مسند احمد کی سماعت کرنے جائے، دو چار حدیثیں نہیں بلکہ تقریباً ساٹھ ہزار حدیثیں۔ اگر کہا جائے کہ جس سال حرانی جنت کو سدھارے، اسی سال نہیں بلکہ اس سے چند سال پیشتر ان کی اتنی ہمت شاید ہوگئی ہو، تو چند سال پیشتر تو قطیعی صاحب اور بھی زیادہ کم سن اور نوعمر ہوں گے اور پھر حرانی نے تو عبداللہ بن احمد کا وقت قطیعی سے کہیں زیادہ پایا، بلکہ خاص امام احمد یا عبداللہ ہی سے مسند احمد کی سند لینے میں کیا دشواری تھی جو کم سن چھوکرے غیر و متقین سے مسند کی سند لیتے۔

ابوبکر قطیعی حرانی کی وفات کے وقت زیادہ سے زیادہ بائیس ہی سال کے ہو سکتے ہیں، کیونکہ قطیعی کی ولادت ۲۷۳ھ کی ہے، جیسا کہ آگے آتا ہے۔ تو اگر خود قطیعی حرانی سے کچھ حدیثیں روایت کرتے، جب بھی شبہ ہوتا کہ انھوں نے تو حرانی کے اختلاط حواس کا زمانہ دیکھا، ان کی سماع صحیح ہے یا نہیں۔ نہ کہ یہ کہا جا رہا ہے کہ حرانی نے اس کبر سنی میں ایک نوجوان سے دو چار حدیث نہیں بلکہ ساٹھ ہزار حدیثوں کا مجموعہ جاکر

بلکہ اس حساب سے ان کی عمر ۱۳۹ سال ہو جاتی ہے۔ ابن حجر یہ بھی لکھتے ہیں کہ احمد بن کامل کا قول ہے کہ حرانی نے ۲۹۲ھ میں وفات پائی۔ اس لئے یقیناً سال ولادت ہی غلط ہے۔ غالباً ۲۰۳ھ یا ۲۰۶ھ میں حرانی کی ولادت ہوئی۔ جب ہی ۸۹ سال کی عمر پاکر ۲۹۲ھ یا ۲۹۵ھ میں ان کی وفات ہوئی۔ مگر بہرحال یہ عبداللہ بن احمد سے عمر میں بڑے ہی تھے اور خاص امام احمد سے مسند کی روایت کر سکتے تھے اور اگر امام احمد یا عبداللہ کے وقت میں مسند کا وجود ہوتا تو قطیعی تو کیا حرانی سے بھی زیادہ معتمد علیہ محدثین مسند کی روایت خاص امام احمد اور نیز عبداللہ سے کرنے والے دنیا میں مشہور و معروف ہوتے۔

۱۔ ابن المذہب کے ترجمے میں ابن حجر، لسان المیزان جلد ۲ ص ۲۷۳ میں ایک موقع پر لکھتے ہیں کہ ابن المذہب نے (ایک روایت میں) قطیعی کے ساتھ ابو سعید الحوفی کا نام بھی بالعکس لگا کر کہا ہے کہ ان دونوں نے کہا کہ ہم سے ابو شعیب الحرانی نے حدیث بیان کی الخ۔ اس سے اتنا معلوم ہوگیا کہ قطیعی نے خود حرانی سے حدیث سنی اور روایت لی ہے نہ کہ حرانی نے قطیعی سے۔

اول سے آخر تک سنا یا سنایا - او بالفرض اگر ایسا تھا تو پھر حرانی کے ترجے میں ابن حجر یا امام ذہبی نے یہ کیوں نہیں لکھا کہ انھوں نے قطیعی سے مسند احمد کی اس بڑھاپے میں سند لی - یا یہ قطیعی سے مسند کی روایت کرتے ہیں - پھر ابن سمعانی نے بھی اپنی کتاب الانساب میں حرانی کا ترجمہ لکھا ہے، وہ بھی یہ نہیں لکھتے کہ مسند احمد کی یہ قطیعی یا کسی سے بھی یہ روایت کرتے ہیں یا قطیعی سے حدیث بھی سنی غرض حرانی کا مسند احمد سے در اصل کوئی واسطہ نہیں ہے اور یہ مسند احمد سے بالکل اسی طرح بے خبر ہیں جس طرح دوسرے محدثین جو قطیعی سے متقدم تھے، مسند سے بے خبر تھے، اس لئے کہ قطیعی کی ولادت سے پہلے مسند احمد کا دنیا میں کہیں نام و نشان بھی نہ تھا۔

ابو بکر قطیعی

احمد بن جعفر بن حمدان بن مالک بن شعیب ابو بکر القطیعی ۲۷۳ھ میں پیدا ہوئے اور ۳۶۸ھ میں وفات پائی چونکہ یہی مسند احمد کے تنہا راوی ہیں، اس لئے اگر ان کی توثیق نہ کی جاتی تو پھر ذخیرۂ روایات کہیں کا بھی نہ رہتا۔ اسی لئے امام ذہبی نے میزان الاعتدال جلد اول صفحہ ۲۱ میں ان کے ترجمے کے ضمن میں اتنا تو اعتراف کیاہے کہ " ابن الفوارس ان کو حدیث میں کچھ یونہی سا سمجھتے تھے اور مسند احمد کے بارے میں ان کے بعض اصول[۱] محل نظر ہیں اور برقانی نے کہا کہ ان کی کتاب کا کچھ حصہ

۱۔ امام ذہبی ہوں یا ابن حجر، مسند کے بھرم کو بہر حال برقرار رکھنا چاہتے ہیں۔ اس لئے اس کے خاص اور واحد تنہا راویوں پر جرح بھی کرتے ہیں تو مسند کو بچاتے ہوئے۔ مسند پر بھی حرف، آتا ہے تو کم سے کم اتنی کوشش رہتی ہے کہ اتنا تو ہو کہ مسند بالکل ہی سرے سے مشتبہ نہ ہو جائے۔ ابن الفوارس کا قول اس طرح نقل کیا ہے، جس سے محل نظر پورا مسند ہی نہ ٹھہر جائے۔ حالانکہ ابن الفوارس پورے مسند ہی کو محل نظر ٹھہراتے ہیں۔

غرق ہوگیا تھا، تو ایک دوسری[1] کتاب جس کے متعلق ان کی سماع نہ تھی، اس سے انھوں نے حدیثیں نقل کر لیں۔ اس وجہ[2] سے محدثین کی ان پر چشمکیں تھیں، اتنا لکھ کر امام ذہبی لکھتے ہیں کہ "ورنہ (یعنی اگر یہ سب باتیں نہ ہوتیں، تو) وہ فی نفسہ ثقہ ہیں۔ پھر خود لکھتے ہیں کہ "ورنہ (خود ان سے سخت متنفر اور بے حد خفا تھا۔ مگر معلوم[3] ہوگیا کہ نہیں یہ سچے آدمی ہیں۔ ان کی سماع میں شک نہیں کیا جاسکتا۔ اور میں نے سنا ہے کہ وہ مجاب الدعوۃ بھی تھے۔" ان کی توثیق کی اتنی کوشش صرف مسند احمد کا بھرم رکھنے کے لئے ہے۔ چنانچہ ابن حجر، امام ذہبی کی اتنی

۱۔ وہ دوسری کتاب کس کے پاس تھی اور جس کے پاس تھی اس نے کہاں سے حاصل کی تھی؟ اور پھر وہاں صرف ابو بکر قطیعی کو اپنی کتاب درست کرلینے کا موقع ملا اور کسی کو وہاں سے مسند کی اجازت یا نقل کا موقع کیوں نہ مل سکا، اور پھر اس شخص نے خود مسند کی روایت کیوں نہ کی۔ اگر عبداللہ بن احمد سے اس کو وہ کتاب ملی تھی تو پھر قطیعی ہی تنہا عبداللہ سے مسند کے راوی نہ ہوئے۔ وہ بھی تو ایک ہوا اور اگر اس کو امام احمد ہی سے مسند ملی تھی جب تو بڑی چیز ہوئی۔

۲۔ محدثین کی چشمکیں تو دراصل اس مسند احمد کے اختراع و اختلاق ہی کی وجہ سے تھیں مگر برقانی نے پردہ ڈالنے کیلئے کچھ حصہ کتاب کے غرق ہو جانے کو چشمک کا سبب قرار دیدیا۔ واقعہ یہ ہے کہ ان کے ہمعصروں نے ان سے مسند احمد کے اصل نسخہ کا مطالبہ کیا تو انھوں نے کہا وہ تو فلاں سفر میں غرق ہوگیا، تو میں نے اپنی یاد سے اور کچھ ردی پرزے پر جو مسودہ تھا اس سے مرتب کرلیا، اسی لئے ان کے ہمعصروں نے اس مسند کو مشکوک قرار دیا اور ان پر چشمکیں ہونے لگیں۔ اتنے بڑے اہم واقعہ کو برقانی نے کس قدر ہلکا کر دکھایا، صرف مسند احمد کا بھرم رکھنے کے لئے۔

۳۔ کس ذریعے سے معلوم ہوا؟ اس کے ذکر کی ضرورت نہ تھی مگر مجھ کو وہ ذریعہ معلوم ہے یعنی یہی کہ دوسرے ہمعصر محدثین نے کہا اگر ان کی سماع کو معتبر نہیں مان لیتے ہیں تو مسند احمد جیسا ذخیرہ روایات ہاتھ سے جاتا ہے اس لئے جس طرح ہم لوگوں نے ان کی سماع صحیح مان لی ہے آپ بھی مان لیجئے اور اس تنفر اور خفگی کو دور کیجئے اور پھر مسند کے پروپاگنڈا کرنے والوں نے قطیعی کے ولی اور مواجب الدعوات ہونے کا بھی پروپیگنڈا کر رکھا تھا۔

عبارت نقل کر کے لسان المیزان جلد ۱ صفحہ ۱۴۵ میں لکھتے ہیں کہ " ذہبی نے جو ابن فرات (کی جرح) پر انکار کیا ہے، اس سے تعجب ہے۔ کیونکہ ابن فرات ہی کچھ اس (جرح) میں متفرد نہیں ہیں بلکہ خطیب نے بھی اس کو احمد بن المسیبی کے ترجمہ میں لکھا ہے۔ پھر آگے چل کر لکھتے ہیں کہ " اور ذہبی سے تعجب ہے کہ ابن الفرات کے قول کی تو (یہاں) تردید کرتے ہیں مگر (انھیں قطیعی کے شاگرد خاص) حسن بن علی التمیمی (ابن المذہب) کے ترجمے کے آخر میں خود لکھتے ہیں کہ یہ بات ظاہر ہے کہ ابن المذہب ایک غیر متقن شیخ تھے، اور انھیں کی طرح ان کے شیخ ابن مالک (القطیعی) بھی اور اسی وجہ سے مسند احمد میں ایسی چیزیں واقع ہو گئی ہیں، جن کی نہ متن ہی درست ہے نہ اسناد ہی، واللہ اعلم۔"

غرض ذہبی اور ذہبی سے زیادہ ابن حجر، قطیعی سے بالکل مطمئن نہیں ہیں، مگر دونوں ہی مسند کی وجہ سے مجبور ہیں۔ اس لئے باوجود دلی تنفر کے کسی نہ کسی حد تک قطیعی کی توثیق ضرور کئے جاتے ہیں تاکہ مسند احمد کا بھرم رہ جائے۔ اگر مسند کا خیال نہ ہوتا تو اللہ جانے یہ لوگ قطیعی اور ابن المذہب دونوں کے متعلق کیا کیا لکھتے۔

قطیعی کے شیوخ دراصل قطیعی کے شیوخ نہ تھے

قطیعی کے شیوخ میں عبداللہ بن احمد کے سوا تین چار امام اور بھی ائمہ رجال نے لکھے ہیں۔ جن میں اکثریت وضاعین و کذابین ہی کی ہے ۔ مثلاً محمد بن یونس السامی الکدیمی وغیرہ، مگر تعجب یہ ہے کہ جہاں ان لوگوں کے تلامذہ کی فہرست ہے، وہاں قطیعی کا کوئی ذکر نہیں اور نہ قطیعی

۱۔ میزان الاعتدال جلد ۱ ص ۲۲۷

کی اتنی عمر ہو سکتی ہے کہ ان لوگوں سے یہ حدیثیں سنیں اور روایتیں اخذ کر سکیں۔ البتہ قطیعی کے حقیقی استاد اور رفیق مذہب و مسلک ابو بکر شافعی کا نام ان لوگوں کے تلامذہ میں آتا ہے۔ جس طرح عبداللہ بن احمد کے ساتھ بھی در اصل ابو بکر شافعی ہی رہے اور ان کے ساتھ بچوں کی طرح یہ قطیعی صاحب بھی لگے لپٹے رہتے تھے۔ ان کو جو کچھ بھی ملا ابو بکر شافعی ہی سے ملا. مگر یہ درمیان سے ابو بکر شافعی کا نام اڑا کر اپنی نسبت کو بلاواسطہ ابو بکر شافعی کے شیوخ سے جوڑ دیا کرتے تھے۔ اسی لئے ان کے اکثر شیوخ ایسے ہی ہیں جو ان کی کم سنی یا آغاز شباب ہی کے وقت دنیا سے رخصت ہو چکے تھے۔ غرض یہ خوب سمجھ لینا چاہیئے کہ در اصل قطیعی کے استاد و شیخ جو کچھ بھی تھے صرف ابو بکر شافعی ہی تھے اور کوئی بھی نہ عبداللہ بن احمد نہ کوئی اور جس کی تصریح آگے ابو بکر شافعی کے ترجمہ میں آتی ہے۔ سلسلہ قائم رکھنے کے لئے ابھی عبداللہ کا ترجمہ ملاحظہ فرمایئے۔

عبداللہ بن امام احمد بن حنبل

ان کی ولادت ۲۱۳ ھ کی ہے اور ۲۹۰ ھ میں انھوں نے وفات پائی۔ حضرت امام احمد کی وفات ۲۴۱ ھ میں ۱۲ ربیع الاول کو ہے یعنی تقریباً آغاز سال ہی میں اور عبداللہ کی پیدائش ۲۱۳ ھ کے وسط میں ہے، اس لئے امام احمد کی وفات کے وقت عبداللہ زیادہ سے زیادہ ۲۷ برس کے تھے۔

ابو بکر قطیعی کی عمر عبداللہ کی وفات کے وقت زیادہ سے زیادہ ۱۷ سال کی ٹھہرتی ہے۔ اس لئے اسی قدر پتا مل سکتا ہے کہ یہ چند سال عبداللہ بن امام احمد کی خدمت میں شاید رہے ہوں مگر اس عمر میں ساٹھ ہزار حدیثوں کے مکمل مجموعے کا سننا اور اخذ کرنا بالکل خلاف عقل ہے کوئی صاحب انصاف اس کو تسلیم نہیں کر سکتا۔

قطیعی دراصل ابو بکر شافعی کے چیلے تھے

البتہ یہ بچپن ہی سے ابو بکر شافعی کے ساتھ لگے رہتے تھے اور ابو بکر شافعی، عبداللہ ابن احمد کے شاگردوں کی جماعت میں داخل ہوگئے تھے۔ عبداللہ اور ابو بکر شافعی کی وفات کے بعد یہ بذات خود عبداللہ بن احمد سے تلمذ کے مدعی ہوگئے۔ اس لئے لوگوں نے ابو بکر شافعی کے ساتھ ان کو بھی عبداللہ بن احمد کے تلامذہ میں شمار کر لیا اس وقت مسند احمد کا کوئی وجود تو تھا نہیں کہ واقعی مسند احمد کو کوئی عبداللہ سے سنتا یا ان کو سناتا اور لوگ یہ خیال کرتے کہ ان کی عمر عبداللہ کے وقت میں اتنی تھی یا نہیں کہ ساٹھ ہزار روایات کا مجموعہ یہ عبداللہ سے اخذ کر سکیں۔

قطیعی نے عبداللہ بن احمد کا وقت نہیں پایا

ان کے ادعائے تلمذ سے ابتدا میں لوگ اسی قدر سمجھے کہ کچھ حدیثیں شاید آخر وقت میں عبداللہ بن احمد سے سنی ہوں گی، اس وجہ سے یہ تلمذ کا دعویٰ کر رہے ہیں۔ کسی کو کیا پڑی تھی کہ خواہ مخواہ اتنی سی بات کو جھٹلاتا جس کے امکان کا قرینہ بھی موجود تھا۔ ہاں اگر یہ عبداللہ بن احمد کے مشہور تلامذہ کے سامنے مسند احمد کا نام لیتے، جب البتہ اکابر محدثین ان کی خبر لینے کو تیار ہو جاتے اور پوچھتے کہ مسند احمد کس جانور کا نام ہے اور تم کہاں سے لائے؟ ہم لوگوں کو تو یہ نعمت عظمیٰ عبداللہ سے نہ ملی جو برسوں عبداللہ کی خدمت میں رہے اور ساری زندگی حدیث کی خدمت میں گذاری اور گذار رہے ہیں۔ اور تم کو ہم سب لوگوں سے چھپا کر بلا کسی

۱۔ ابو بکر شافعی کا ترجمہ آگے آتا ہے۔

استحقاق کے عبداللہ بن احمد نے اتنی بڑی دولت چپ چاپ سونپ دی؛ آخر تم میں کون سے سرخاب کے پر لگے تھے۔

یہ مسند احمد کب اور کس طرح وجود میں آئی، اس کی تفصیل آگے آتی ہے۔ خاص مسند احمد کے ذکر میں۔ ابھی سلسلے کی آخری کڑی یعنی احمد بن محمد بن حنبل کا مختصر سا ترجمہ سن لیجئے۔

امام احمد بن محمد بن حنبل

ان کی ولادت ۱۶۴ھ میں اور وفات ۲۴۱ھ میں ہوئی ۷۷ سال کی عمر پائی۔ امام شافعی، ابن مہدی، ابو الولید، عبدالرزاق، وکیع، یحییٰ بن آدم اور یزید بن ہارون سے یہ خود بھی روایت کرتے ہیں اور یہ لوگ بھی ان سے روایت کرتے ہیں، یعنی یہ سات آدمی ان کے شاگرد بھی ہیں اور استاد بھی۔ اور قتیبہ داؤد بن عمرو اور خلف بن ہشام ان سے عمر میں بڑے تھے۔ مگر ان کے تلامذہ میں تھے۔ اور احمد بن الحواری، یحییٰ بن معین، علی بن المدینی۔ حسین بن منصور، زیاد بن ایوب ابو قدامۃ السرخسی، محمد بن رافع، محمد بن یحییٰ بن ابی سمینہ اور عبدالرحمان بن ابراہیم جن کا لقب "رحیم" تھا یہ نو آدمی ان کے اقران میں سے اور ان کے خاص شاگرد اور خود بلند پایہ محدثین میں سے تھے۔ اور عبداللہ اور صالح ان کے دونوں صاحبزادے بھی ان کے خاص شاگرد تھے۔ ان اکابرین محدثین کے علاوہ ابو بکر الاثرم، بقی بن مخلد، حرب الکرمانی، حنبل بن اسحٰق، شاہین بن السمیدع اور میمون بھی ان کے مشہور تلامذہ میں سے تھے۔ پھر امام بخاری، امام مسلم اور ابو داؤد بذات خود بلا واسطہ بھی ان سے روایت کرتے ہیں اور بواسطہ ابو عبدالرحمان اسود بن عامر

الشافعی ملقب بہ شاذان بھی۔ امام احمد کے آخری شاگرد، جو ابو امام احمد کے بعد عبداللہ بن احمد کے بھی شاگرد ہوئے۔ مشہور محدث ابو القاسم البغوی ہیں۔ اور ان بزرگوں کے علاوہ ایک جماعت کثیر امام احمد کے تلامذہ میں ہے جن میں سے بہتیروں کے نام ہتذیب التہذیب وغیرہ کتب رجال میں مذکور ہیں۔

سلسلہ اسناد کے تمام افراد کو جان لینے کے بعد اب خاص مسند احمد کے وجود اور اس کی نوعیتوں پر غور فرمایئے۔

مسند احمد

اب یہ چیز ہر صاحب عقل بغیر ذہن پر زور ڈالے سمجھ سکتا ہے کہ اگر امام احمد بن حنبل اپنی زندگی میں کوئی مجموعہ اپنی حدیثوں کا قلم بند کرجاتے یا اپنے صاحبزادے عبداللہ سے لکھواتے تو جس طرح امام مالکؒ سے ان کی مؤطا ان کے سینکڑوں شاگردوں نے سنی، اور ہر سننے والا ان سے مؤطا کی روایت کرتا تھا۔ اسی طرح امام احمد کے مسند کو بھی عبداللہ کے علاوہ ان کے دوسرے تلامذہ بھی ضرور امام احمد سے سنتے اور اس کی روایت کرتے۔ اتنے بڑے بڑے محدثین، جو نہ صرف امام احمد کے شاگرد تھے، بلکہ استاد بھی تھے، یا خاص اقران میں تھے، یا عمر میں بڑے تھے یا اپنے علم و فضل کی وجہ سے علم حدیث میں بہت بلند پایہ رکھتے تھے، باوجود اس کے کہ یہ سب کے سب امام احمد کے شاگرد تھے، آخر یہ سارے کے سارے اس ضخیم مسند کے وجود سے بالکل بے خبر کیوں رہے اور امام احمد نے ان سب کے سب سے اپنی اس کتاب کو پوشیدہ کیوں رکھا؟ یہاں تک کہ اپنے دوسرے بیٹے صالح کو بھی اس نعمت عظمیٰ سے بالکل محروم ہی رکھا تعجب ہے کہ امام بخاری اپنی تاریخ میں امام احمد کا

ذکر خیر کرتے ہیں، مگر نہ مسند کا کوئی ذکر فرماتے ہیں نہ کتاب الزہد کا۔ آخر امام احمد کو کیا ہوگیا تھا کہ اشاعت حدیث و اشاعت دین کے عوض اپنے تمام شاگردوں سے بالکل کتمان حدیث وکتمان علم فرمایا اور صرف اپنے ایک ہی صاحبزادے عبداللہ کو اس کتاب مکتوم کا محرم راز بنایا، آخر دوسرے لوگوں سے اخفاء و کتمان کی کیا ضرورت پڑی؟ کیا ان کے تلامذہ میں سے عبداللہ کے سوا کوئی بھی اس امانت عظمیٰ کا امین نہیں ہوسکتا تھا؟

عبداللہ کے تلامذہ ابو القاسم البغوی

اسی طرح عبداللہ بن احمد کے تلامذہ میں ابو القاسم البغوی جن کی ولادت ۲۱۳ھ کی ہے یعنی عبداللہ سے ایک سال بڑے ہی تھے اور خاص امام احمد کے آخری شاگرد تھے یعنی عبداللہ کے خواجہ تاش استاد بھائی بھی تھے اور شاگرد بھی۔ اور خود مشہور بلند پایا محدث تھے ۳۱۷ھ میں عبداللہ بن احمد کے ستائیس سال بعد وفات پائی۔

سلیمان بن الطبرانی

سلیمان بن حرب احمد بن ایوب اللخمی الطبرانی جن کی ولادت ۲۶۰ھ کی اور وفات ۳۶۰ھ میں ہے، پورے سو برس کی عمر پائی، عبداللہ کی وفات کے وقت تیس برس کے تھے۔ اور قطیعی سے تیرہ سال بڑے تھے اور بقول ابن حجر ۱۳ سال کی عمر سے حدیثیں سننے لگے اور برابر عبداللہ بن احمد کے ساتھ لگے رہے۔

احمد بن کامل بن شجرہ

احمد بن کامل بن شجرہ القاضی البغدادی۔ ان کی ولادت بھی ۲۶۰ھ ہی کی ہے۔ نوے سال کی عمر پاکر ۳۵۰ھ میں راہی جنت ہوئے۔ ابن حجر نے ان کو من اوعیۃ العلم (علم کا ظرف) لکھا ہے۔

محمد بن مخلد

محمد بن مخلد بن حفص، جنھوں نے کافی عمر پاکر ۳۳۱ھ میں وفات پائی۔ دار قطنی جیسے مشہور محدث کے شیوخ میں تھے اور قطیعی سے کافی بڑے تھے عمر میں بھی اور علم و فضل میں بھی۔ ابن حجر ان کے متعلق لکھتے ہیں کہ اپنے وقت میں سب سے بڑے عالم تھے۔ وغیرہم۔

غرض ایسے ایسے تلامذہ کے ہوتے ہوئے عبداللہ بن احمد کو کیا ہوگیا تھا کہ وہ اسی کتاب مکنون مسند احمد جس کو امام احمد نے اپنے تمام شاگردوں سے چھپا کر صرف انھیں کو بطور ایک پوشیدہ راز کے عطا فرمایا تھا۔ ایسی نعمت عظمیٰ کو انھوں نے بھی اپنے تمام شاگردوں سے چھپا کر بلا استحقاق دیا بھی تو صرف ایک سترہ سال کے چھوکرے ابو بکر قطیعی کو!

تفو بر تو اے چرخ گرداں تفو !

جس طرح امام احمد نے اپنے دوسرے تمام تلامذہ سے حتیٰ کہ اپنے دوسرے بیٹے سے بھی اس مسند کو پوشیدہ رکھا بالکل اسی طرح عبداللہ نے بھی اپنے تمام شاگردوں سے باپ کی دی ہوئی نعمت کو پوشیدہ ہی رکھا اور

ایک گھر سے باہر کے کم عمر چھوکرے کے حوالے کر دیا!

امام احمد کو تو شاید اولاد کی محبت نے اس راز داری پر مجبور کر دیا ہو اور دوسرے بیٹے سے شاید وہ کچھ خفا سے رہتے ہوں، اس لئے اپنی ساری عمر کی کمائی صرف ایک ہی بیٹے کو دے گئے اور دوسرے کو بالکل محروم کر دیا۔ مگر یہ ابو بکر قطیعی جیسے سترہ سال کے چھوکرے سے عبداللہ کو کون سا رشتہ محبت تھا کہ عبداللہ نے اپنے تمام برابر والے اور علم و فضل میں مستند شاگردوں میں اس چھوکرے کو ترجیح دی، اور سب کو اس نعمت سے محروم ہی نہیں، بلکہ بالکل بے خبر رکھا، کسی سے کہا تک نہیں کہ میرے پاس والد ماجد کی ایک کتاب ہے۔

پھر ابو بکر قطیعی کے تلامذہ میں بھی ابن المذہب کے علاوہ کچھ لوگ مثلاً حافظ ابو نعیم احمد بن عبداللہ بن اسحٰق صاحب حلیۃ الاولیاء اور علی بن الحسن المستقلی القزوینی وغیرہما بھی تھے۔ مگر ابن المذہب کے سوا کوئی دوسرا شخص اس مسند کی روایت نہیں کرتا، آخر اس کی کیا وجہ ہے؟

ابن المذہب کے بھی دو چار شاگرد ضرور ہونگے مگر ابن المذہب سے بھی صرف ابو القاسم ہبۃ اللہ ہی تنہا اس کی روایت کرتے ہیں اور کوئی دوسرا نہیں۔

اور ابو القاسم ہبۃ اللہ صاحب کے بعد صرف حنبل بن اسحٰق الرصافی ہی اس کو لئے پھرتے ہیں۔ یعنی چھٹی پشت سے اس مسند کی روایتی نسل کی چھوٹی چھوٹی شاخیں پھوٹنا شروع ہوتی ہیں۔ اور رفتہ رفتہ ادھر ادھر پھیلنے لگتی ہیں مگر پانچ پشت اوپر تک برابر مکمل راز داری اور پورے

۱۔ علی بن الحسن المستقلی القزوینی کا ترجمہ لسان المیزان جلد ۴ ص ۲۲۰ میں ہے ۴۰۲ھ میں وفات پا چکے تھے۔

اخفا و کتمان کے ساتھ ایک ایک ہی شخص ہر دور میں اس مسند کا تنہا راوی چلا آتا ہے ۔ اگر کوئی حدیث اس طرح کی ہو جس کا راوی مسلسل ہر عہد میں ایک ایک ہی شخص رہا ہو، اور وہ بات ایسی ہو جس کے جاننے والوں کے تعدد کو عقل چاہتی ہو، تو ایسی حدیث آحاد قرار دے کر ضعیف اور ناقابل احتجاج قرار دے دی جاتی ہے اور یہاں ساٹھ ہزار حدیثوں کا پورا مجموعہ پانچ پانچ دَور تک ایک ایک ہی شخص کی وساطت سے چلا آرہا ہے مگر کسی محدث کے منہ میں توبان ہنیں کہ اس پورے مجموعے کو آحاد کہکر ٹھکرا دے، خصوصاً جب اس کے دو آخری راوی بالکل مجہول الحال ہیں اور اس کے اوپر کے دوراوی ابن المذہب اور ابو بکر قطیعی غیر متقن اور ناقابل احتجاج۔

سلسلہ مسند کی اصلی اور ابتدائی مگر پوشیدہ کڑی

ابو بکر شافعی

عبداللہ بن احمد کے تلامذہ میں ابن حجر اور تمام ائمہ رجال ابو بکر شافعی کا نام لکھتے ہیں اور یہ ضرور عبداللہ بن احمد کے ساتھ کچھ مدت تک لگے لپٹے رہے ابن حجر ان کا متعلق ذکر ہی ہنیں کرتے ۔ البتہ امام ذہبی نے تذکرۃ الحفاظ جلد ۳ صفحہ ۹۱ میں ان کا ترجمہ سپرد قلم فرمایا ہے، مگر افسوس کہ وہ ان کی حقیقت حال تک نہ پہنچ سکے اور نہ ان کو کوئی خاص ضرورت محسوس ہوئی کہ ان کے متعلق اتنی کرید کرتے۔ ابن حجر غالباً ان کی حقیقت سے واقف ہوگئے تھے، اس لئے ان سے قطع نظر ہی کرنا مناسب سمجھا۔ نہ تہذیب التہذیب میں ان کا ذکر کیا نہ لسان المیزان میں نہ تقریب میں ۔ نہ تعجیل المنفعہ میں۔ تعجب یہ ہے کہ دولابی نے بھی

الاسماء و الکنی میں ان کا ذکر نہ کیا۔ البتہ سمعانی نے ان کو کتاب الانساب میں یاد کیا ہے۔ لکھا ہے کہ یہ مقام ختلی میں پیدا ہوئے اور بغداد میں سکونت اختیار کی۔ اس لئے ختلی بھی اپنے آپ کو لکھتے ہیں اور بغدادی بھی، یعنی کبھی یہ کبھی وہ ۔ عمر زیادہ پائی ، یہاں تک کہ دار قطنی نے بھی ان سے روایت کی ہے۔ لکھا ہے کہ ابو علی بن شاذان وغیرہ نے ایک بار مسجدوں میں سب صحابہؓ لکھا ہوا پایا، تو فوراً انھوں نے اپنی برأت کے لئے لوگوں کو فضائل صحابہؓ لکھوانا شروع کیا۔ ۲۶۰ ھ میں پیدا ہوئے ۳۵۴ ھ میں مرے۔ دار قطنی وغیرہ نے ان کی توثیق کی ہے۔ الخ۔

محمد بن عبداللہ بن ابراہیم بن ثابت ابو بکر بغدادی

ابن حجر نے لسان المیزان جلد ۵ صفحہ ۲۲۸ میں محمد بن عبداللہ بن ابراہیم بن ثابت ابو بکر البغدادی کا ترجمہ لکھا ہے ۔ اور لکھا ہے کہ ان کو زعم تھا کہ یحییٰ بن معین اور امام احمد بن حنبل سے یہ روایت کرتے ہیں مگر دار قطنی نے ان کو دجال کہا ہے ، اور خطیب نے لکھا ہے کہ یہ حدیثیں گھڑا کرتے تھے ۔ مجھے تو اس کا شبہ سا ہوتا ہے کہ یہ حضرت ابو بکر شافعی ہی ہیں ۔ دار قطنی کی توثیق و روایت کا ذکر جو سمعانی نے کیا ہے وہ کسی معتبر ذریعے سے سمعانی تک نہیں پہنچی ہوگی۔ واللہ اعلم۔ اس لئے کافی تفحص و جستجو کرکے میں جس صحیح نتیجے پر پہنچا ہوں، وہ حسب ذیل ہے۔

موسیٰ بن سہل الوشاء

ابو بکر شافعی ۲۶۰ ھ میں پیدا ہوئے اور ۳۵۴ ھ میں دنیا سے رخصت ہوئے ۔ ان کے سب سے پہلے استاد موسیٰ بن سہل الوشا شافعی تھے ،

جن کو عقیلی نے غیر مشہور دار قطنی نے ضعیف اور برقانی نے قطعی ضعیف لکھا ہے، ابن علیہ کے سب سے آخری شاگرد تھے۔ ۲۷۸ ھ میں وفات پائی۔

محمد بن شدادا لمستملی

جب ابو بکر شافعی موسیٰ بن سہل کی آغوش تربیت سے بقضائے الہیٰ محروم ہوگئے تو محمد بن شدادا لمستملی کی گود میں آگرے اور ان سے تعلیم پانے لگے۔ ان کو بھی برقانی نے ضعیف، امام ذہبی نے معتزلی اور منکر الحدیث اور دار قطنی نے ضعیف و ناقابل احتجاج قرار دیا ہے۔

درحقیقت ابو بکر شافعی کی پوری دماغی پرورش انہی دونوں کی آغوش تربیت میں ہوئی۔ ۲۶۰ ھ میں ابو بکر شافعی پیدا ہوئے اور ۲۷۲ ھ سے دشاہ کی خدمت میں رہنے لگے، یعنی ۱۲ سال ہی کی عمر سے۔ گذشتہ دو اساتذہ کے علاوہ محمد بن سعید البورقی کے بھی یہ شاگرد رشید ہیں۔

محمد بن سعید البورقی

یہ بورقی صاحب وہی ہیں، جو سلیمان بن جابر سے روایت کرتے ہیں اور مشہور و معروف وضاع ہیں یعنی جھوٹی حدیثیں گھڑنے والے۔

محمد بن یونس الکدیمی

اور پھر محمد بن یونس الکدیمی، جو جانے بوجھے کذاب اور افترا پرداز ہیں، ان کے بھی ہنایت خاص شاگرد ہیں اور اسی قسم کے۔

ابو بکر شافعی کے بعض دوسرے شیوخ

چند اور مثلاً محمد بن حزین ۔ بن نصر اور ابو جعفر الترمذی، اسحق بن ابراہیم بن سنین الختلی جن کی کتاب الدیباج مشہور ہے ۔ محمد بن ہارون بریہ الہاشمی. سعید بن ہاشم الطبری، ابو عمارۃ محمد بن احمد بن مہدی ، محمد بن الحسن بن محمد بن سماء الحضرمی، ابراہیم بن اسمعیل المسمعی البصری، اور انھیں جیسے بعض دوسرے مجروحین و متروکین و ضعفاء کے حلقۂ فیض سے یہ استفاضہ کرتے رہے۔

مگر در حقیقت یہ بورقی اور کدیمی کی تیار کردہ ایک پوشیدہ پارٹی تھی، جو ایک پوشیدہ گہری سازش کے ماتحت باہم تقسیم اسمائے صحابہؓ و اکابر تابعینؒ کرکے ان کے ناموں سے موضوعات کا انبار لگا رہی تھی اور اس کے لئے ابو بکر شافعی تیار کئے گئے تھے کہ یہ عبداللہ بن احمد کے پاس آیا جایا کریں اور ان کے تلامذہ کی فہرست میں اپنا نام لکھوالیں تاکہ عامہ محدثین ان کو عبداللہ کا شاگرد جان جائیں۔

یہ باوجود عبداللہ بن احمد کی شاگردی کا شرف حاصل کرنے کے حنبلی نہ بنے بلکہ شافعی بنے رہے اور اپنے کو حنبلی نہیں بلکہ شافعی مشہور کیا تاکہ دونوں فرقوں سے تعلقات رہیں۔ مگر یہ ابو بکر شافعی در اصل امامی شیعہ تھے۔

ابو بکر شافعی در اصل شیعہ تھے۔

اور تقیۃً اپنے کو شافعی مشہور کئے رہے اور تقیہ ہی کرکے عبداللہ بن احمد کے شاگرد بھی بنے تھے۔ اب اس دعوے کی دلیل اور اجمال کی تفصیل یوں سنئے۔

تذکرۃ الحفاظ میں ابو بکر شافعی

ان ابو بکر شافعی صاحب کا پورا نام امام ذہبی تذکرۃ الحفاظ میں یوں تحریر فرماتے ہیں دیکھئے جلد ۳ صفحہ ۹۱ محمد بن عبداللہ بن ابراہیم بن عبدویہ البغدادی ۔ انھوں نے اہل سنت کو دھوکہ دینے کے لئے جس طرح مسلک شافعی بظاہر اختیار کرکے اپنے ساتھ شافعی کی نسبت کو شہرت دے رکھی تھی، اسی طرح اپنی اصلی کنیت جو ابو الحسن تھی، اہل سنت کو دھوکا دینے کے لئے ابو بکر سے بدل کر مشہور کر رکھی تھی اور اسی طرح ابو بکر شافعی ہی کے لقب سے مشہور و متعارف رہے۔ یہ بھی خوب یاد رکھئے کہ ان کے پر دادا کا اصلی کسی نام کے بعد ح کی علامت جو بنی ہوتی ہے ممدوح کا مختف ہے ۔ خود مصنفین کتب رجال شیعہ نے اس کی تصریح کر دی ہے۔ دیکھئے وجیزہ صفحہ ۱۹۳

ابو بکر شافعی کے عوض ابو بکر القتانی

مگر اسی رسالہ کے باب الکنیٰ میں ابو بکر شافعی کے عوض " ابو بکر القتانی" لکھ کر وہی علامت ح کی بنا دی ہے ۔ جو ان کے نام کے ساتھ بنائی ہے ۔ اور ابو بکر شافعی کا ذکر باب الکنیٰ میں ہنیں کیا۔

شرح تصریحات علمائے شیعہ

علامہ حلّی اور صاحب منتہی المقال نے ابو بکر شافعی کی نشان دہی کی ۔ مگر علامہ مجلسی نے نام کی تصریح تو کی ، مگر کنیت کا مطلق ذکر ہی نہ کیا صاف کھا گئے ۔ اور ابو بکر شافعی کے عوض ابو بکر القتانی لکھ کر اس طرح

اس پر پردہ ڈالا کہ کسی کا ذہن ہی نہ جائے کہ یہ ابو بکر شافعی ہی ہیں اور ان تینوں نے مل کر ابو بکر شافعی کے باپ کا نام یعنی عبداللہ کو درمیان سے بالکل غائب ہی کر دیا یا ممکن ہے کہ ابو بکر شافعی نے خود ہی تقیہ کے ماتحت اہل سنت کو اپنا سلسلہ نسب بتانے میں ایک نام عبداللہ کا بڑھا دیا ہو ۔ واللہ عالم ۔ پھر کوئی تو محمد بن ابراہیم بن یوسف لکھتا ہے اور کوئی صرف محمد بن یوسف ۔ وہ تو غنیمت ہوا کہ خود صاحب منتہی المقال نے یہ گتھی اس طرح سلجھا دی کہ کوئی ان کو ان کے باپ کی طرف منسوب کرتا ہے اور کوئی ان کے دادا کی طرف مگر ان کے دادا یا پردادا کا لقب جو عبدویہ انھوں نے خود دے رکھا تھا، اس کو ان میں سے کوئی بھی نہیں لکھتا۔ تماشا یہ ہے کہ سال وفات کا بھی مطلق ذکر نہیں کیا جاتا ۔ صرف علامہ حلّی سال ولادت لکھتے تو ہیں مگر متعارف طریقہ جو سال ہجری کا ہے اس سے گریز کرکے ایک بالکل غیر متعارف چیز یعنی حسینی[1] کے حساب سے نام یوسف تھا، مگر انھوں نے عبدویہ لقب دے کر اہل سنت میں مشہور کیا اسی لئے شیعوں کی بعض کتب رجال میں ان کا نام یوں ہے " محمد بن ابراہیم بن یوسف ۔

۱۔ سال حسینی کا حل مجھ کو اخی الاعظم حضرت مولانا قاری شاہ محمد سلیمان پھلواروی سے اور ان کو نواب محسن الملک سے معلوم ہوا کہ رحمہا اللہ تعالیٰ ہیں نے اس کی پوری تفصیل اپنے رسالے آیۃ التطہیر میں لکھ دی ہے ۔یہاں طوالت کے خوف سے اس کا اعادہ ضروری نہیں سمجھتا ہوں۔ مختصر یہ ہے کہ اس کا آغاز بعثت نبوت سے آٹھ سال پیشتر سے اہل تشیع کرتے ہیں اور جس کی بنیاد ایک خواب بتاتے ہیں، جو شیعوں کی روایت کے مطابق رسول اللہ صلعم کو امام حسینؓ کے متعلق بعثت سے آٹھ سال پہلے دکھایا گیا تھا اور ان کے یہاں اس خواب کا اخفا، و کتمان بھی فرض ہے اور سال حسینی کا اخفا بھی ۔ مگر زندگی بھر میں واقف کاروں پر دو ایک مرتبہ اس کا استعمال بھی واجب ہے ۔ غالباً اسی بناء پر علامہ حلی نے یہاں استعمال کر لیا۔

الکاتب یعنی ابا الحسن[1] جیسا کہ " خلاصۃ الاقوال " میں علامہ حلی مشہور محدث شیعہ نے لکھا ہے اور اس طرح ان کا نام تحریر فرما کر لکھتے ہیں کہ " قال احمد بن عبدون ھو ابو بکر الشافعی مولدہ سنہ ۲۸۱ الحسینیہ و کان علی الظاھر یتفقہ علی مذھب الشافعی و یری رای الشیعہ الامامیہ فی الباطن و کان فقیھا علی المذھبین و لہ علی المذھبین کتب یعنی احمد بن عبدون نے فرمایا کہ وہ ابو بکر شافعی ہیں ان کی ولادت حسینی سال کے حساب سے ۲۸۱ میں ہوئی اور یہ بظاہر مذہب شافعی کی فقہ پڑھتے، مگر باطن میں شیعہ امامیہ کا عقیدہ رکھتے تھے اور دونوں مذہب کے فقیہ تھے اور دونوں مذہب پر ان کی کتابیں ہیں۔ دیکھئے خلاصۃ الاقوال صفحہ ۰۰

منتہے المقال میں ابو بکر شافعی

اور دوسرے شیعہ محدث امام فن رجال ابو علی محمد بن اسمٰعیل بن عبدالجبار اپنی کتاب منتہی المقال میں لکھتے ہیں کہ " ابو بکر الشافعی ھو محمد بن یوسف، کذا فی المجمع فلعلہ ینسب تارۃ الی ابیہ و تارۃ الی جدہ و ذکرہ من طبقہ ثقتھم۔ یعنی ابو بکر شافعی وہ محمد بن یوسف ہیں۔ ایسا ہی کتاب المجمع میں ہے۔ شاید ان کی نسبت کبھی ان کے باپ کی طرف کی جاتی ہو اور کبھی ان کے دادا کی طرف۔ یعنی کسی نے محمد بن ابراہیم کہا کسی نے محمد بن یوسف کہہ دیا۔ اور لوگوں نے ان کو

۱۔ یعنی محمد بن ابراہیم بن یوسف الکاتب جن کی کنیت ابو الحسن ہے جیسا کہ ابتدائے ترجمہ میں علامہ حلی نے لکھا ہے۔

ثقہ لوگوں کے طبقے میں ذکر کیا ہے۔

علامہ مجلسی کی الوجیزہ

علامہ مجلسی تیسرے مشہور شیعہ مجتہد و محدث اپنی کتاب الوجیزہ میں لکھتے ہیں. محمد بن ابراہیم بن یوسف ح" شیعوں کی کتب رجال میں جس سے علمائے اہل سنت تو کجا شیعوں میں سے بھی خاص خاص ہی لوگ واقف ہیں۔ اس طرح کی تدلیس یعنی ناموں میں ادل بدل شیعی علماء بہت کیا کرتے ہیں کہ علمائے اہل سنت اگر یہ کہیں کہ یہ تو شیعہ ہے، تو جواب میں کہدیا جائے کہ نہیں تو، شیعہ تو دوسرا ہے، جس کے بار میں آپ کہتے ہیں وہ سنی ہے، چنانچہ دونوں کے ناموں میں کافی فرق موجود ہے۔ آپ کا ابو بکر شافعی محمد بن عبداللہ بن ابراہیم بن عبدویہ ہے، جس کی ولادت ۲۶۰ھ کی ہے۔ اور ہمارا ابو بکر شافعی محمد بن ابراہیم بن یوسف یا محمد بن یوسف جس کا سال پیدائش ۲۸۱ھ ہے۔ باقی رہا سال حسینی تو اگر امام حسین کی ولادت سے بھی لیجئے. تو سال ہجری سے بھی کم ہی ہوگا نہ کہ اکیس برس آگے، اس لئے یہ دوسرے ہی ابو بکر شافعی ہیں، جو پہلے شافعی مذہب رکھتے تھے۔ اس کے بعد شیعہ امامیہ مذہب اختیار کر لیا۔ مگر پہلے لقب سے مشہور رہ گئے۔

علمائے شیعہ کی تدلیس

اسی طرح کی تدلیس شیعے ہمیشہ کرتے رہتے ہیں۔ مثالاً ملاحظہ ہو۔

مندل بن علی الغزی

مندل بن علی الغزی اہل سنت کی کتابوں میں ایک شیعہ راوی ہے۔

مگر شیعوں نے ان کو اپنی کتابوں میں مبدل بہ علی الغزی لکھا ہے اور تصریح کر دی کہ مبدل بائے موحدہ تحتانیہ سے اور الغزی تائے مثناۃ فوقانیہ و رائے مہملہ سے ۔ تاکہ دونوں دو شخص سمجھے جائیں اور مبدل کے حقیقی بھائی حبان بن علی بن الغزی کو صرف حبان ۔

حبان بن علی الغزی

گویا تبان بنا کر تصریح کردی کہ یائے مثناۃ تحتانیہ سے اور بس یہاں غزی کو عتری نہیں بنایا، تاکہ یہ دونوں ایک دوسرے کے بھائی بھی نہ سمجھے جائیں۔ دونوں کے نام بھی کتابوں میں اتنے فاصلے سے تیار ہوتے ہیں کہ دونوں میں کسی مناسبت کا خیال بھی نہ جاسکے گا۔
مندل کا نام باب المیم میں بہت بعد کو آئے گا اور حبان کا نام باب الحاء المہملہ میں کتاب کے دوسرے ہی ربع میں موجود ہوگا۔

اسی طرح ابو جعفر محمد بن جریر بن یزید الطبری کو جن کی تفسیر اور تاریخ مشہور ہے اور جو بالاتفاق شیعہ تھے ، ابو جعفر محمد بن جریر بن رستم الطبری لکھ دیا ۔ تاکہ اہل سنت دونوں کو دو شخص سمجھ لیں، چنانچہ یہی ہوا اور امام ذہبی و ابن حجر جیسے علمائے رجال دونوں کو دو سمجھتے رہے. حالانکہ رستم طبرستان کا رہنے والا تھا. اسلام قبول کرنے کے بعد اس کا نام یزید رکھا گیا ۔ ابن جریر نے خود یہ تدلیس کی کہ جو کتابیں خاص شیعوں کے لئے لکھیں، اس میں اپنے دادا کا نام اس نے رستم ہی رہنے دیا اور جو کتابیں عام مسلمانوں کے لئے تصنیف کیں، ان میں اپنے دادا کا نام یزید لکھا۔ شیعوں کے لئے جو کتابیں لکھیں وہ عام نگاہوں سے اس وقت تک برابر پوشیدہ رہیں، جب تک کہ ایران میں حکومت صفویہ قائم نہ

ہوئی تھی۔ جس طرح شیعوں کی تمام خاص کتابیں اور مخصوص عقیدے اس سے پہلے تک برابر پردۂ کتمان میں رہے۔ ابن جریر کی خاص شیعی تصنیفیں بھی نہاں خانۂ کتمان ہی میں محفوظ رہیں۔ حکومت صفویہ کے استحکام کے ساتھ ہی ساری پوشیدہ چیزیں منصہ شہود پر آگئیں۔ اور شیعے اپنے اصلی عقیدے اور حقیقی رنگ و روپ میں نمایاں ہوگئے۔ اس وقت اس کا خیال ہوا کہ ایسا نہ ہو کہ ابن جریر کی تصنیفات سے علمائے اہل سنت بد ظن ہوکر اس کو حجت و سند نہ سمجھیں، تو پھر جو جو تخم ریزیاں ابن جریر اپنی اس تفسیر اور تاریخ میں کر گئے ہیں بار آور نہ ہو سکیں گی، اس لئے فوراً علمائے شیعہ نے اپنی کتابوں میں ایسی تصریحیں لکھنا شروع کر دیں. جس سے یہ معلوم ہو جائے کہ ابن جریر ایک نہیں بلکہ دو تھے اور وہ علماء و عقلائے شیعہ جو ایران سے باہر اہل سنت کے ساتھ گھلے ملے تھے، اہل سنت میں زبانی اس کا پروپیگنڈا بھی کرتے رہے اور یہ ایک خیال اہل سنت کو بھی ایسا رہا کہ اگر اس چیز کو ہم فلاں فلاں صحیح اور حقیقی وجوہات کی وجہ ہی سے سہی مگر رد کر دیتے ہیں یا مشتبہ و غیر مستند مان لیتے ہیں تو پھر یہ چیز ہمیشہ کے لئے ہمارے ہاتھ سے چلی جاتی ہے اور ایسی دوسری چیز ہمارے پاس ہے نہیں جو اس کا نعم البدل ہو. اس لئے ہم ان صحیح و واقعی وجوہات سے چشم پوشی کرلیں گے یہاں تک کہ بر بنائے ضرورت اس کی واقعیت ہی سے انکار کر دیں گے. مگر اس دولت کو ہاتھ سے جانے نہ دیں گے۔ یہ حلوائے بادام کی قاب فی الجملہ زہر آلود ہی سہی، مگر ہے تو حلوائے بادام۔ اس کی زہر آلودگی سے انکار کر کے تھوڑا تھوڑا کھاتے رہیں تو اس کا مزہ تو آئے گا ہوس تو مٹے گی۔ زہر آلود کہہ کر واپس کر دینے سے ہوس اور ستائے گی اور یہ یاد کر کر کے کہ ہائے کیا

خوش رنگ اور خوش بو حلوا تھا اور بھی رہ رہ کے طبیعت بے چین ہوگی۔ بس یہی وجہ تھی کہ تفسیر طبری و تاریخ طبری کو بھی اہل سنت نے گلے لگایا اور مسند احمد کو بھی۔ اور اسی طرح سنن نسائی اور مستدرک حاکم وغیرہ کو بھی۔

رجوع بسوئے مقصد

غرض اتنی تفصیل کے بعد آپ کو ابو بکر شافعی کی پوری حقیقت معلوم ہوگئی کہ یہ ایک پکا منافق شخص تھا، درحقیقت شیعہ رافضی تھا اور تقیہ کرکے شافعی بنا ہوا عبداللہ بن احمد کے ساتھ لگا رہا۔ اور اس کی پیٹھ پر وہ کدیمی اور بورقی والی پارٹی تھی۔ جو درحقیقت بالکل اسی کی طرح تقیہ باز تھی۔

تصریح سلسلہ تالیف مسند

اور وہ سب کے سب شیعہ ہی تھے مگر اہل سنت بنے ہوئے۔ عبداللہ بن احمد کی وفات کے بعد اپنی پارٹی کی جمع کردہ جھوٹی سچی روایات کو یکجا کرکے پورا ذخیرہ "حدثنا عبد الله حدثني ابي" لکھ لکھ کر مرتب کر ڈالا (یہ شخص تھا بڑا لکھاڑ اور خوشخط، چنانچہ شیخ حلی نے ان کے نام کے ساتھ الکاتب کا لفظ لکھا بھی ہے۔) اور اس کی متعدد نقلیں بھی اپنی جماعت کی مدد سے اس نے مہیا کرلیں مگر فوراً اس کی اشاعت ہوتی تو پھر عبداللہ کے دوسرے تلامذہ بنہایت سختی کے ساتھ تکذیب کرتے۔ اس کا ڈر لگا ہوا تھا، اس لئے جب تک عبداللہ کے تمام بڑے بڑے تلامذہ ایک ایک کرکے راہئ عدم نہ ہولئے۔ اس وقت تک تو کسی سے مسند احمد کا نام تک نہیں لیا گیا۔ یہاں تک کہ اس انتظار میں ابو بکر شافعی خود ہی ۳۵۴ھ

میں دنیا سے رخصت ہونے لگے اور ابھی طبرانی جیسا جلیل القدر محدث متوفی ۳۶۰ھ میں عبداللہ بن احمد کے شاگرد رشید موجود تھے۔ آخر ابو بکر شافعی نے مرتے وقت ابو بکر قطیعی کو یہ امانت سپرد کر دی اور بزبان حال کہا کہ

سپردم بتو مایہ خویش را

قطیعی تو ابو بکر شافعی کے ساتھ رہتے ہی تھے، اور انھیں کے تربیت یافتہ وہم مسلک وہم خیال۔ پھر سن شعور کے بعد سے برابر شریک کار بھی رہے، یعنی ترتیب مسند میں بھی ابو بکر شافعی کے معین و مدد گار رہے، اس لئے انھوں نے اس مہم کو اپنے ذمے بشوق تمام لے لیا۔ اور اب کام ہی کیا تھا۔ پکی پکائی سیر تو سامنے تھی صرف کھالینا تھا۔ طبرانی کے انتقال کے بعد یہ ادھر ادھر گھومنے لگے۔ مگر پھر بھی کہیں مسند احمد کا نام لینے کی ہمت نہیں پڑتی تھی۔ اپنے کو عبداللہ بن احمد کا شاگرد بھی مشہور کر ہی چکے تھے اور لوگوں نے تسلیم بھی کر لیا تھا کہ عبداللہ کے آخر وقت میں کچھ حدیثیں ان سے سنی ہوں گی۔ ۱۶۔۱۷ سال کی عمر محض بچپن کی عمر نہیں۔

پھر جس طرح ابو بکر شافعی کو یہ ابو بکر قطیعی مل گئے تھے، بالکل اسی طرح ابو بکر قطیعی کو بھی "جو ئندہ یا بندہ" کے مطابق آخر ایک ہم راز شاگرد ابن المذہب مل ہی گیا جو درحقیقت منافقت میں ابو بکر شافعی اور ابو بکر قطیعی دونوں کا ہم مذہب تھا۔ اسی ابن المذہب نے مسند احمد کی اشاعت کا بیڑا اٹھایا اور ابو بکر قطیعی کے انتقال کے کم سے کم پچاس برس بعد یعنی پانچویں صدی ہجری کے پہلے ربع کے گزر جانے کے بعد دیکھا کہ

اب میدان بالکل صاف ہے۔ عبداللہ بن احمد ہی نہیں بلکہ ان کے اکابر تلامذہ کے دیکھنے والے بھی اب بہت کم رہ گئے۔ تکذیب کا خطرہ اب بہت زیادہ نہیں رہا، اس لئے ادھر ادھر مسند احمد کا ذکر کرنے لگے۔ چنانچہ خطیب بغدادی سے بھی انھوں نے اپنے سلسلے کا ذکر کیا، جیسا کہ ابن حجر نے خطیب کا قول نقل کیا ہے مگر خطیب جیسا نقاد، ابن المذہب کے دامِ تزویر میں کب آ سکتا تھا۔ اگر واقعتاً خطیب کو ابن المذہب پر کچھ بھی اعتماد ہوتا تو خطیب ضرور ابن المذہب سے مسند کی سند و اجازت لے لیتے، خطیب ہی نہیں، بلکہ خطیب کے ہم عصر اللہ جانے کتنے محدثین ابن المذہب سے مسند کی سند و اجازت لئے ہوتے۔ مگر کسی نے بھی ان کے اس دعویٰ کی طرف توجہ نہ کی۔ بخوبی ممکن ہے کہ خطیب اور اس وقت کے دوسرے محدثین نے ابن المذہب کی تکذیب بھی کی ہو، مگر بعد والوں نے فقط مسند کا بھرم رکھنے کے لئے اس پر پردہ ڈال دیا، مگر عملی تکذیب پر کس طرح پردہ ڈالا جا سکتا ہے؟ اگر زبانی تکذیب کا کوئی ثبوت نہیں تو یہ تو روز روشن کی طرح واضح ہے کہ خطیب اور اس وقت کے سارے محدثین نے عملی بے اعتنائی و بے توجہی سے درحقیقت ان کی تکذیب کر کے دکھا دی۔ ذہبی و ابن حجر زبانی تکذیب کا ذکر نہ کریں مگر اس عملی تکذیب کو جو آفتاب کی طرح چمک رہی ہے، کس طرح چھپا سکتے تھے۔ مگر زبانی تکذیب بھی ضروری تھی۔ جبھی تو ذہبی و ابن حجر باوجود توثیق مسند کی ضرورت کے ابن المذہب و قطیعی کو زبان روکتے روکتے بھی غیر متقن وغیرہ لکھ گئے۔

مختصر یہ کہ باوجود اس کے کہ یہ اپنے ہم عصر محدثین کے پاس مسند کو عمر بھر لئے پھرے مگر کسی نے کبھی توجہ نہ کی۔ آخر اپنے دونوں اگلے

مقتداؤں کی طرح یہ بھی صرف ایک شاگرد ابو القاسم ہبۃ اللہ کو ڈھونڈ نکالنے میں کسی طرح کامیاب ہوگئے۔ اور مسند کی امانت انھیں کے سپرد کرکے ۴۴۴ھ میں دنیا سے سدھار گئے۔

ان ابوالقاسم ہبۃ اللہ صاحب کا بھی بالکل وہی ابن المذہب جیسا حال ہوا ساری عمر مسند احمد کو ہر جگہ ڈھوئے ڈھوئے پھرے، مگر علمائے حدیث میں سے ایک شخص نے بھی نگاہ اٹھا کر ان کی طرف نہ دیکھا۔ مجبوراً اپنے اسلاف کی طرح یہ بھی ایک غیر معروف شخص حنبل بن عبداللہ الرصافی کو اشاعت مسند کی خدمت کسی طرح تفویض کرگئے۔ چنانچہ حنبل بن عبداللہ الرصافی کے سوا اور کوئی شیخ القاسم ہبۃ اللہ یا کسی سے بھی مسند کا راوی نظر نہیں آتا۔ اگر کوئی ہو بھی تو اس سے مسند کی کوئی اہمیت نہیں ثابت ہوتی، جس طرح حنبل بن عبداللہ الرصافی کے بعد دو چار راویوں کی تعداد مل جانے سے کوئی فائدہ نہیں، مگر اب تک رصافی کے سوا ہبۃ اللہ سے کوئی اور مسند کا روایت کرنے والا کہیں نظر سے نہیں گزرا۔

مشتبہ احاد روایتیں کبھی قابل قبول نہیں ہوتیں

محدثین کا متفقہ اصول ہے کہ کوئی ایسی روایت جس کے متعلق عقل اس کی مقتضی ہو کہ کسی خاص عہد یا ہر عہد میں اس کے جاننے والے اور اس کی روایت کرنے والے بہت کافی لوگ ہوں۔ ایسی حدیث کو اگر اس خاص عہد یا ان سب عہدوں میں صرف ایک یا ایک ایک ہی راوی ایک دوسرے سے روایت کرتے چلے آرہے ہوں۔ تو وہ حدیث صرف احاد ہونے کی وجہ سے ظنی ہی نہیں کہی جائے گی بلکہ موضوع یا مشتبہ ہونے کی حیثیت سے رد کر دی جائے گی۔

حدیث آحاد ظنی اور آحاد مشتبہ اور دونوں کا فرق

عہد صحابہؓ یا عہد تابعی یا عہد تبع تابعی میں کسی حدیث کو صرف ایک ہی شخص اگر روایت کر رہا ہو تو وہ حدیث آحاد ہے۔ اگر تینوں زمانوں میں صرف ایک ہی ایک شخص روایت کرتا ہو یا دونوں میں، تو دہرے یا تہرے آحاد ہونے کی وجہ سے اس کی ظنیت زیادہ قوی ہو کر اشتباہ سے قریب یا قریب تر ہوگی۔

مگر ایسی حدیث جس میں ایسی بات بیان کی جا رہی ہو جس کے متعلق عقل اس کا یقین رکھے کہ اس حدیث کے جاننے والوں اور روایت کرنے والوں کی کچھ زیادہ تعداد ضرور ہونی چاہیئے۔ مثلاً ۱۔ وہ واقعہ بیان کیا جارہا ہے ایک مجمع یا جماعت کے سامنے کا ۲۔ امر یا نہی ہونے کی وجہ سے اس کا حکم پوری یا کسی خاص جماعت پر عائد ہو رہا ہو۔ اس لئے اس پر اس جماعت کا عمل درآمد ضرور ہونا چاہیئے۔ ۳۔ کہا گیا ہو کہ اس کی اطلاع سب کو یا کسی خاص جماعت کو دیدو۔ ۴۔ کسی خاص جماعت یا عامۃ المسلمین کو مخاطب کیا گیا ہو۔ ۵۔ کسی خاص قبیلے یا جماعت کی تعریف میں وہ حدیث وارد ہوئی ہو۔ ۶۔ وہ واقعہ جو بیان کیا گیا ہے کوئی غیر معمولی ہو تعجب خیزی کی وجہ سے مثلاً معجزہ وغیرہ یا کسی اور اعتبار سے۔ ۷۔ جو واقعہ مروی ہو وہ اپنی اہمیت کے اعتبار سے غیر معمولی ہو، وغیرذلک۔

اس قسم کی روایت کا صرف کسی ایک ہی صحابی سے مروی ہونا ضرور شبہے میں ڈالتا ہے کہ آخر دوسرے صحابہؓ اس کے متعلق خاموش کیوں رہے اور تابعین نے اس کے متعلق کسی دوسرے صحابی سے کیوں نہیں

۱۔ مثلاً صرف عورتوں یا مردوں یا صرف جوانوں یا صرف بوڑھوں یا صرف مسافروں پر وغیرہ۔

دریافت کیا، اگر اسی ایک صحابی سے متعدد تابعی اور ہر تابعی سے متعدد تبع تابعین بھی روایت کرتے ہوں، جب بھی صرف ایک ہی صحابی سے اس کا مروی ہونا محل اشتباہ ہونا ضرور ہے۔ اسی طرح متعدد صحابہؓ سے صرف ایک ہی تابعی اگر روایت کر رہے ہوں. جب بھی وہ اشتباہ سے خالی نہیں۔ علیٰ ہذا القیاس اگر صحابہ و تابعی سب کا تعدد ہو، مگر سب سے صرف ایک ہی تبع تابعی روایت کر رہا ہو۔

اور اگر ایک صحابی سے ایک تابعی اور اس ایک تابعی سے کئی تبع تابعین روایت کر رہے ہوں تو یقیناً اشتباہ دہرے ہونے کی وجہ سے موکّد ہوجائے گا اور اگر ایک صحابی سے ایک تابعی اور اس ایک تابعی سے صرف ایک ہی تبع تابعی روایت کرے۔ جب تو تہرے اشتباہ کی وجہ سے وہ روایت بہت زیادہ مشتبہ تر ہو جائے گی۔ اور ان تمام صورتوں میں اس قسم کی روایتیں اپنے مراتب اشتباہ کے مطابق مشتبہ ہوں گی اور ان میں سے کوئی روایت بھی کسی بات میں بھی حجت و سند نہیں سمجھی جائیگی اور ضرور وجب الرد ہوگی، اس لئے کہ ہم کو تو قرآن مجید میں اتباع ظن اور اتباع ماتشابہ سے منع کیا گیا ہے اور یہ شان کفار و مشرکین اور گمراہوں کی بتائی گئی ہیں۔ اسی لئے حدیث میں حکم ہے کہ و ایاک وا لمشتبہات یعنی مشتبہ باتوں سے سخت احتیاط کرو۔

تو جب ایک روایت جو اس طرح کی آحاد ہو، وہ مشتبہ ہو جاتی ہے اور اس کا یہ حال ہے تو پورا ذخیرہ جس میں تقریباً چالیس ہزار روایتوں کا انبار لگا ہوا ہے، یہ سارا دفتر مجھ کو کتابی صورت میں مجتمع ایسی بھیانک اور غیر معمولی آحادیث سے پہنچتا ہے جس کی احادیث کا سلسلہ تین سو برس تک مسلسل منفرد و مشتبہ راویوں کی پانچ چھ روایتی پشتوں تک

یکے بعد دیگرے بلا شرکت دیگرے و بے مداخلت غیرے چلا آرہا ہے، اس کے ناقابل اعتبار اور مشکوک ہونے میں کیا شک ہے، حقیقت یہ ہے کہ یہ امام احمد کے نام پر اسی قسم کی ناروا ساحرانہ حرکت ہے، جیسی کہ سامری نے قبضۃ من اثر الرسول کے ذریعہ کی تھی۔ اور جس طرح اس وقت سامری اپنا اثر جمانے میں کامیاب ہوگیا تھا اسی طرح ابو بکر شافعی اور اس جیسے دوسرے سامری مسلمانوں کو دھوکہ دینے میں کامیاب رہے۔ و سیعلم الذین ظلموا ای منقلب ینقلبون ۲۶۵/ ۲۲۷

نوٹ : علامہ تمنا عمادی کے حالات کے لئے اسی ادارہ کی شائع کردہ کتاب اعجاز القرآن ملاحظہ فرمائیں جس میں سے یہ مضمون لے کر کتابچہ کی شکل میں شائع کیا گیا ہے۔

